نخل

قیمت { فی پرچہ : ۵۰ نئے پیسے
سالانہ ۔ ۔ ۔ دس روپے

زبانِ خلق

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد)

مضامین اچھے ترتیب بھی قابلِ تعریف، خدا مبارک کرے اور رسالے کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)

کل نگار نظر نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ایک طرف آپ نے نگار کی روایات کا لحاظ رکھا ہے اور دوسری طرف اس میں کئی خوشگوار اضافے کیے ہیں۔ مستقبل کے لیے پروگرام بھی شاندار ہے۔

یوں تو اور مضامین بھی قابلِ قدر ہیں لیکن غالبیہ کا عنوان مجھے بہت پسند آیا۔ یہ بہت مفید سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی .....

آپ نے یہ بڑی ذمہ داری اٹھالی ہے لیکن آپ کی صلاحیت اور انہماک سے توقع ہوتی ہے کہ اس کا حق ادا کریں گے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم (علی گڑھ)

غالبیہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ یوں تو میرا خیال ہے کہ اگر ہم لوگ ایک عرصے کے لیے غالب کو اپنی قبر میں آرام کرنے دیں تو غالباً جانبین کے لیے بہتر ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ میری رائے کوئی مانے گا نہیں اور جیسا کہ صفحہ ۲۵ کے اشتہار میں کہا گیا ہے غالب سے چھیڑ چلتی رہے گی۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی)

نئے سال کا نیا تحفہ دلکش و حسین نگار کی شکل میں جلوہ نما ہوا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

اللہ تعالیٰ ہر میدان میں آپ کو اکبر ہی رکھے۔

میکش اکبر آبادی (آگرہ)

خوشی کی بات ہے کہ آپ نے نگار کا معیار قایم رکھا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ "غالبیہ" کے اضافے سے اس کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی۔ تاباں کی غزل بہت ہی بہتر ہے۔ ابھی میں جستہ جستہ ہی مطالعہ کر سکا ہوں۔ مگر اپنے ذہن میں ایک قسم کی حرکت محسوس کر رہا ہوں اس لیے امید ہے کہ انشاء اللہ کبھی کوئی خدمت [illegible] گا۔

غلام ربانی تاباں (دہلی)

آپ نے بہت محنت سے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ واقعی بہت پسند آیا۔

مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ)

نگار ملا۔ شکریہ۔ پاکستانی ایڈیشن بھی آج دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل ہے اور وہ نقل۔ معلوم ہوتا ہے آپ نگار کے دفتر سے دہی کا غذ اٹھالائے اور دہی کاتب۔ طباعت اور کتابت بہت اچھی ہے۔ اس کی داد اس لیے دے رہا ہوں کہ اچھی طباعت کی رامپور میں امید نہ تھی

مضامین سب اچھے ہیں آپ نے اچھا کیا کہ باری تعالیٰ پر سنجیدہ اور بھاری بھرکم مضمون کے فوراً بعد حسرت موہانی پر ایک ہلکا پھلکا خاکہ شایع کر دیا تاکہ رسالہ متوازن ہو۔

محمد عتیق صدیقی (علی گڑھ)

(یہ) دیکھ کر جی خوش ہوا کہ آپ نے نگار کی سابقہ روایات کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ شکل و صورت کتابت اور مواد نگار کے ماضی کا آئینہ دار ہے خدا آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ اس کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

غالبیہ دیکھا بہت اچھا ہے

آپ نے آئندہ کا جو پروگرام پیش کیا ہے وہ بھی خاصا شاندار ہے اور آپ کی اہلیتوں سے توقع ہے کہ آپ کامیابی کے ساتھ اس کو پورا بھی کر سکیں گے۔

مرتضیٰ حسین فاضل (لاہور)

نگار ملا..... اتنا دل کش کہ کرشمہ دامن دل کھینچنے لگا۔ جو صفحہ الٹا وہ عنوان نظر فروز و ذوق افزا سے آراستہ تھا۔ خدا اس نگار بسیار شیوہ کو آپ کے ہاتھوں تابندہ و پایندہ رکھے۔

ظفر قریشی (مدیر ماہ نو کراچی)

غالبیہ والی تجویز اور اس کی ابتدا بہت اچھی ہے آپ لوگ یہ کام خوب کر سکتے ہیں غالب کو اپنی عمر میں اتنے اور ایسے قدر دان نہیں ملے جتنے اب ملے ہیں اور رامپور والوں نے تو بھئی اس کی ہر طرح عزت افزائی کی اور سرپرستی بھی۔

فاضل زیدی (چک ضلع سکھر)

بخدا آپ نے خوب رسالہ نکالا —— اور غالبیہ تو بہت ہی خوب مرتب کیا ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس موضوع میں دلکشی باقی نہیں رہ گئی۔ لیکن آپ نے اس میں بھی جدت و ندرت پیدا کر دی۔ میرے خیال میں غالب کے متعلق اتنا مواد اور کہیں نہیں مل سکتا — اسے آپ کا کارنامہ کہنا چاہیے۔

ضروری اعلان :— پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں رسالہ جاری کر دیا جائیگا — نمائندہ نگار این ۶۱۷ سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ ۲

ملاحظات	۲	غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط	عبادت بریلوی ۱۸
غالب اور صہبائی	مالک رام ۵	غالب انڈگوئٹے (مزاح)	حاجی لق لق ۱۹
غالب سے متعلق دو خط (صاحبِ حیات کے نام)	اکبر علی خاں ۸	طالب — غالب کا ایک گمنام شاگرد	نادم سیتاپوری ۲۲
غالب کی مثنوی بے نام کا نام	سید مرتضیٰ حسین فاضل ۱۲	دیوانِ کامل وشاداں	رشید حسن خاں ۳۱

ملاحظات

انا للہ رازیزدانی صاحب کا ۱۲ جنوری کو اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ میرے لیے متوقع ہوتے ہوئے بھی سخت تھا۔ متوقع اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دل کے مریض تھے اور اس پر اپنی بیماری کی طرف سے بے پروا بھی۔ ویسے بھی دل کی بیماری سے کون جانبر ہوا ہے۔

جب میں نے نگار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ان کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ دراصل میں نے یہ کام اسی لیے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کہ مجھے اُن سے بہت کچھ توقعات تھیں اور وہ بے جا بھی نہیں تھیں، میں نے اُن سے مضمون کے لیے کہا اور وہ انھوں نے تیار کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو مضمون اُن سے جنوری کے شمارے کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور جس کی کتابت تک ہو چکی تھی وہ اس بار بھی نہیں آسکا۔ فروری کے شمارے کے لیے انھوں نے غالب کے ہاں سہل ممتنع کا موضوع انتخاب کیا تھا۔ اور یہی ان کا آخری مضمون تھا جو نامکمل رہ گیا۔

رازصاحب میں کام کرنے کی جیسی لگن تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس پر طرفہ ان کی گرفت تھی۔ وہ بہت جلد اپنے موضوع کا احاطہ کر لیا کرتے تھے۔ اور اُس سے بھی کم وقت انھیں مواد کو ترتیب دینے میں لگتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خان آرزو پر اپنا مضمون دو چار روز میں مکمل کر لیا تھا (یہ مضمون نقوش کے تازہ خاص نمبر میں شایع ہو چکا ہے) اس لیے میں مطمئن تھا کہ اگر فوری ضرورت پیش آئی تو یہ دو تو یسی کام دے جائے گی۔ لیکن آج یہ سہارا ٹوٹ چکا ہے۔ اور میں ان کی یاد میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

رازصاحب نے ساری عمر شاعری اور صحافت میں گزاری ۵۶ء میں وہ عرشی صاحب کے ترغیب دلانے پر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے اور دو اہم موضوعات پر دل لگا کر کام کیا۔ ان میں سے ایک تھا رام پور کا ماحول شعر و سخن اور دوسرا اردو کی داستانیں۔ ان میں سے آخری کو انھوں نے میرے اصرار پر کتابی شکل میں مرتب کر کے میرے ہی حوالے کر دیا تھا۔ یہ کتاب (انشاء اللہ) جلد شایع ہو جائے گی۔

آج کل وہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے جو مولانا عرشی پر یہ نٹیشن والیوم کے نام سے موسوم تھا۔ جب اُن کے ذہن میں یہ اسکیم آئی تو شاید انھوں نے سب سے پہلے مجھ ہی سے اس کا ذکر کیا میں نے انھیں بتایا کہ یہی کام مالک رام صاحب بھی کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھے لکھ بھی چکے ہیں

اس لیے آپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔ مرحوم نے کہا میں انھیں بھی لکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس کام میں اپنے ساتھ شریک کرلیں"۔ یہ جملہ اس لیے بڑا اہم ہے کہ اس سے اُن کی منکسر المزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے۔

وہ خود بھی بڑے جذباتی آدمی تھے۔ مظفر علی سید نے اردو تحقیق پر نقوش میں ایک مضمون لکھا اُس میں عرشی صاحب کا بھی ذکر کیا۔ رازصاحب سید صاحب کی رائے سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے یہ کہا وہ انھیں بھی کتاب کے مرتبین میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کہنے لگے تم انھیں لکھو۔ میں نے جواب دیا کہ میرا لکھنا موزوں نہیں آپ ایک کام کر رہے ہیں تو آپ ہی لکھیے بولے آغاز تم کرو میں بعد کو لے بڑھا لوں گا چنانچہ یہی ہوا میں نے سید صاحب کو خط لکھا انھوں نے تائیدی جواب دیا اور پھر رازصاحب کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ انھوں نے کتاب کے سلسلے میں بہت سے لوگوں کو لکھا۔ مجھ سے اکثر مشورہ ہوتا رہا۔ مگر یہ سخت تاکید ہوتی تھی کہ عرشی صاحب کو نہ معلوم ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ بات زیادہ نہیں چھپ سکتی تھی۔ عرشی صاحب کو معلوم ہو گئی اور انھوں نے مرحوم کو روکنا چاہا، اس پر میرے پاس بہت افسردہ آئے اور کہنے لگے کہ میں مالک رام صاحب کو اور عندلیب شادانی صاحب کو (عرشی نامہ کے ایک مرتب شادانی صاحب بھی ہیں) لکھتا ہوں کہ اب آپ ہی عرشی صاحب کو لکھ کر اجازت لیں۔ ابھی اُدھر سے جواب نہ آنے پائے تھے کہ خود ہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ یہ کام اس حد تک ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک روز پہلے شام کو اپنے ایک شاگرد پر شدید تقاضا کیا کہ وہ پریس سے طباعت کا تخمینہ بنوا لائیں جو مالک رام صاحب نے ان سے طلب کیا تھا۔

اس سلسلے میں جب کسی کا خط آتا تھا بے حد مسرور ہوتے تھے۔ سارے ہی اہم لوگوں کو دعوت دی تھی، ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، ڈاکٹر علیم صاحب، علامہ نیاز فتحپوری صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، ڈاکٹر باقر صاحب، شیخ محمد اکرام صاحب، پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، پرنسپل عبدالسلام خاں صاحب ——— ان میں سے کچھ کے مقالے انھیں مل گئے تھے۔ باقی سب کے وعدے تھے۔

کئی بار ذکر آیا کہ "اگر میں یہ مکمل نہ کر سکوں تو مواد ضایع نہ ہو" میں بات کو ٹال دیتا تھا۔ اس لیے کہ اقرار کے معنی یہ تھے کہ میں خود بھی ان کی زندگی سے مایوس ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان پر برا اثر ہی مرتب کرتی۔ اب اُن کا جمع کیا ہوا یہ مسالہ ان کی وصیت کے مطابق مالک رام صاحب کو بھیج دیا جائے گا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ جو اس کام کا مجوز ہے وہی تنہا اسے انجام بھی دے۔

رازصاحب کا ایک مجموعہ کلام حرب و ضرب کے نام سے کبھی شایع ہوا تھا اب وہ بھی ناپید ہے اس کے بعد بھی بیس بائیس سال انھوں نے جو کہا وہ مدون نہ ہو سکا۔ نگار کے ایک نمبر میں اس کلام کا نمائندہ انتخاب اور رازصاحب کے اہم متفرق مضامین شایع کرنے کا ارادہ ہے جو یقیناً اردو ادب کو رام پور کا ایک یادگار تحفہ ہوگا۔

موجودہ شمارہ زیر نظر شمارے میں غالب اور اُس سے متعلق عنوانات پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ارادہ ہے کہ یہ بدعت برابر جاری رہے یعنی ہر سال فروری کے شمارے میں غالب پر مضامین شایع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہاں ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں میری رائے میں غالب پر لکھنے والوں کو یہ التزام کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مضامین ماہِ نو، آجکل اور اب ایک اور اضافہ ——— نگار ان ہی میں اشاعت کے لیے بھیجیں۔ اس طرح آئندہ کام کرنے والوں کو در بدر مارا مارا پھرنا نہیں پڑے گا۔ آئندہ خود میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ غالب پر سال کے مختلف حصوں میں ادھر ادھر شایع ہونے والے مضامین میں سے اہم نگار میں نقل کرتا رہوں، تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت ہو سکے۔

اس بار وعدے کے باوجود مسلسل شایع ہونے والے کتاب غالبیہ کا دوسرا باب صفحات کی کمی کی بنا پر نہیں دیا جا سکا۔ اگرچہ اُسی کتاب کے ایک اور باب سے غالب سے متعلق دو خط شایع کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ قطع وعدہ خلافی کا جرم بھی سرزد نہ ہو۔ ان خطوں سے متعلق اختلافی حواشی نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ ابتدا میں صرف تعارفی سطریں درج کی گئی ہیں۔ ا

مجھے مسرت ہے کہ متفقہ طور پر غالبیہ کی اشاعت کو قارئین نے سراہا۔ مجھے اس کتاب کی ترتیب کا خیال دستور الفصاحت کی ترتیب کو دیکھ کر آیا تھا، جس کے حواشی میں عرشی صاحب نے دوسرے تذکروں سے احوال شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ تذکروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا جائے، جس میں اردو کے اہم شاعروں کے بارے میں تمام تذکروں کے بیانات یکجا کیے جائیں۔ اور اس کا آغاز اپنے محبوب شاعر غالب سے کیا تھا۔ مگر اب اس کی وسعت کا اندازہ ہوا ہے تو سوچتا ہوں سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ میرے اکیلے کرنے کا یہ کام نہیں۔ اس کے لیے بے اندازہ وقت مکمل توجہ اور وافر روپے کی ضرورت ہے جو اس دور میں کہاں میسر ہیں۔ اس لیے میری رائے میں اب علیحدہ علیحدہ شاعروں پر اپنی اپنی دلچسپی کے ماتحت دوسرے لوگ بھی کام کریں تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اس میں یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ ہماری توجہ کے لائق کون ہے اوّل و دوم درجے کے شعرا کو چھوڑ کر اگر ہم چوتھے اور پانچویں درجے پر آجائیں تو نہ صرف اس کا فائدہ بڑا محدود رہ جائے گا بلکہ تضیع اوقات بھی ہوگی۔

یہ کام یونیورسٹیوں کے اردو شعبے بھی ایم اے اور پی ایچ ڈی کے طلبا سے کرا سکتے ہیں بشرطیکہ رہنمائی کرنے والوں میں صلاحیت ہو اور وہ اسے اپنے سے فروتر بھی نہ جانیں۔

شاداں کا دیوان میں شایع کرنا چاہتا تھا۔ نگار کی اشاعت کا کام سنبھالا تو سوچا کہ کیوں نہ اسے غالب کے لیے وقف شمارے میں چھاپ دیا جائے۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ رام پور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ خمخانۂ جاوید میں کچھ اور اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس کے لیے رشید حسن خاں صاحب سے ایک مختصر تعارف بھی لکھوا لیا اور اس طرح کامل کے متفرق کلام کے ساتھ یہ دیوان بھی چھاپا جا رہا ہے۔ یہ اس سلسلہ نوادر کا آغاز ہے جو رام پور رضا لائبریری کے ذخیرے سے حاصل کر کے چھاپے جائیں گے۔

شاداں کا ذکر مکاتیب غالب (عرشی) تلامذۂ غالب (مالک رام) کے علاوہ فغان دہلی، فریاد دہلی، سخن شعرا، خمخانۂ جاوید، انتخاب یادگار۔ تذکرۂ کاملان رام پور، تذکرہ طور کلیم، اور ذکر غالب میں بھی ہے۔

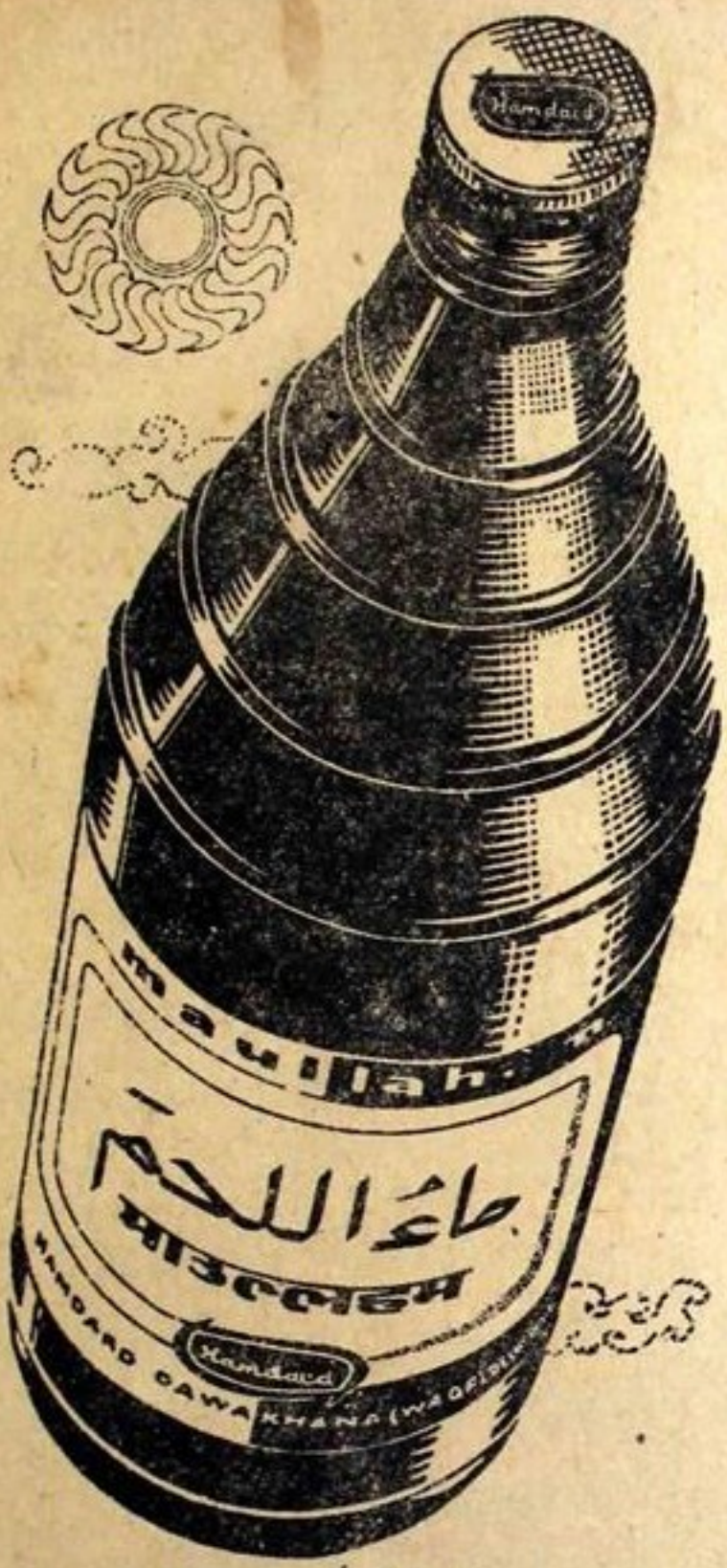

ہمدرد کا **ماءالشعیر**

بھوک کو بڑھاتا ہے اور دورانِ خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت، نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

دہلی
کانپور
پٹنہ

ہمدرد

HMD. 1834 H

غالب اور صہبائیؔ

مالک رام

غالبؔ کی خود بینی اور خود ستائی اب اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ اس پر کسی تفصیل سے لکھنا تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں۔ وہ ہندوستان کے کسی فارسی گو شاعر اور ادیب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خطوں میں تقریباً تمام ہندوستانی شاعروں اور نثر نگاروں کے نام آئے ہیں اور انھوں نے ان میں سے ایک حضرت امیر خسروؒ کے سوائے کسی کو نہیں بخشا۔

اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہمعصروں سے متعلق ایک قطعے میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے فرماتے ہیں:۔

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم — چہ بمنّتِ بسیار نہی از کم شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ و انگاہ — حسرتیؔ اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن، ہم نفس و ہمدمِ شاں

یہاں انھوں نے اپنے چھ معاصروں کا نام لیا ہے اور اپنے آپ کو انکسار سے ان کا محض ہم نفس اور ہمدم کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں سے ایک صہبائیؔ ہیں۔

صہبائیؔ، جن کا اصلی نام امام بخش تھا، نجیب الطرفین تھے۔ سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی پر اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے۔ ان کا خاندان تھانیسر کا رہنے والا تھا، لیکن یہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ یہ عبداللہ خاں علویؔ کے شاگرد تھے، جن کا نام غالبؔ کے مندرجہ صدر قطعے میں بھی آیا ہے۔ ان کا کلیاتِ فارسی ان کے ایک ہندو شاگرد (دین دیال میر منشی اجنٹی بھوپال) نے جمع کر کے چھپوایا تھا۔ اردو میں بھی ان کی بعض نثری چیزیں ملتی ہیں۔ قدیم دلی کالج کے پرنسپل فیلکس بوترو کی فرمایش پر انھوں نے ۱۸۴۳ء میں شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن اس میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی کی ہے۔ یعنی عبارت میں اتنا ردوبدل اور حذف و اضافہ کیا ہے کہ یہ کتاب ان کی مستقل تالیف ہو گئی ہے۔ اصلی کتاب میں مثالیں فارسی میں تھیں، ان کی جگہ انھوں نے اردو کی مثالیں مہیا کی ہیں۔ بعض جگہ مثالوں میں اپنے چند اردو شعر بھی درج کیے ہیں، ورنہ یوں وہ اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ اسی کالج کی ترجمہ سوسائٹی کے لیے انھوں نے اردو شاعروں کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔ ہر ایک انتخاب سے پہلے انھوں نے شاعر کے مختصر حالات اردو نثر میں لکھے ہیں۔ یہ انتخاب بھی اسی سوسائٹی کی طرف سے ۱۸۴۴ء میں شایع ہوا تھا۔ سرسیّد کی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی وہ برابر کے شریک رہے تھے، بلکہ ایک پورے کا پورا باب انہی کا لکھا ہوا تھا۔ جب ۱۸۴۰ء میں دلّی کالج میں عربی کی طرح فارسی کے لیے بھی ایک اچھا مستعد مدرس رکھنے کی تجویز ہوئی، تو اس جگہ پر صہبائیؔ ہی کا تقرر ہوا تھا۔ ان بیچاروں کا انجام بہت حسرت ناک ہوا۔ اپنے دو جوان بیٹوں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غالبؔ کے اس قطعے سے خیال ہو گا کہ وہ صہبائیؔ کی شاعری کے قایل اور معترف ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ خدا معلوم، وہ کس تاثر کے تحت یہ لکھ گئے۔ ورنہ انھوں نے اور جہاں کہیں بھی صہبائیؔ کا ذکر کیا ہے، حقارت اور مذمت کے لہجے میں۔ برہانِ قاطع کے مباحثے میں صہبائیؔ کے

شاگرد میرزا رحیم بیگ میرٹھی نے بھی غالب کے جواب میں ایک کتاب ساطع برہان لکھی تھی۔ میاں داد خاں سیاح، غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے کسی خط میں اس کتاب کا ذکر کیا، تو انھیں لکھتے ہیں[1]:-

"وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملا کے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔"

اگرچہ یہاں انھوں نے سیاح کو لکھا تھا کہ ساطع برہان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، لیکن بعد کو انھوں نے خود ایک طویل خط میرزا رحیم بیگ کے نام لکھ کر اسے نامۂ غالب کے عنوان سے شائع کیا۔ میرزا رحیم بیگ نے ساطع برہان میں اپنے استاد کے نام (امام بخش) کی رعایت سے ایک مقام پر ان کے اسم گرامی سے پہلے "امام المحققین" لکھا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مینو نامۂ غالب میں ایک جگہ میرزا رحیم بیگ سے پوچھتے ہیں[2]:-

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو 'امام المحققین' خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک نہ اجماع محققین کا ہوگا، یہ خطاب بہ اجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ وہ فرماں روائے عہد شہنشاہ کہلائے گا، کئی بادشاہ جس کے فرمان پذیر ہو جائیں گے۔ ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا، یہ میر شہنشاہ صاحب کیونکر شاہجہاں و جہانگیر ہو جائینگے! اگر حضرت بفتحۂ قاف بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے، تو ایک ماموں آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

میرزا نے نامۂ غالب اپنے خرچ پر طبع کروایا تھا اور دور نزدیک اس کے نسخے دوست احباب میں تقسیم کر دیے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایک صاحب مولوی عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری تھے۔ معلوم ہوتا ہے میرزا نے انھیں بھی اس کا نسخہ بھیجا تھا۔ اس پر شاکر نے مکتوب الیہ (میرزا رحیم بیگ) سے متعلق پوچھا اور چاہا کہ اگر ہو سکے تو ساطع برہان کا نسخہ بھی مہیا کیا جائے۔ اس پر انھیں لکھتے ہیں[3]:-

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دلے اس میچ دلوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ رسالہ اس کا ساطع برہان دلی پہنچ کر ڈھونڈوں گا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔"

معلوم نہیں اہلِ دلی نے کیا کہا اور کیوں کہا! بے شک، انھوں نے اپنے کلام پر تو صہبائی سے اصلاح نہیں لی تھی، لیکن گلستانِ سخن (ص، ۲۴۱) میں صاف لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے چند رسائل نثر اصلاح کے لیے صہبائی کو بھیجے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے سے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیا تلمذ کے لیے یہ کافی تصور نہیں کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں گلستانِ سخن سے زیادہ اور کوئی بیان قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔

لیکن غالب نے رحیم اور شاکر کے نام صہبائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی رائے ان سے متعلق کیا تھی۔ دراصل ہر جگہ ایک ایک لفظ سے ان کی توہین اور علمی بے وقری کا اظہار مقصود ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ برہان قاطع کی بحث میں میرزا اپنا توازن کھو بیٹھے تھے اور اس معرکے میں جو بھی ان کے مدمقابل ہوا، انھوں نے اسے نیچا دکھانے کے لیے جائز اور ناجائز تمام حربے استعمال کیے۔ علمی دلائل سے گزر کر

---

[1] اردوئے معلی، ص ۲۳ (مطبع کریمی، لاہور) [2] عود ہندی، ص ۱۳۸ تا ۱۲۹ (مطبع کریمی، لاہور — [3] عود ہندی، ص ۱۵۱، ۱۵۲
[4] یہ خط رامپور سے لکھا گیا تھا۔

...نز و طعن اور تمسخر و تشنیع سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں ...فاق سے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اصلی ہدف تو میرزا رحیم بیگ ...تھے، صہبائی بیچارے اُن کے استاد بھی لپیٹ میں آگئے۔ اگر اور کوئی ...ہادت موجود نہ ہوتی، تو یہ توجیہہ کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن ...نھوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال ...یے ہیں۔

میرے اپنے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ ہے، ...س میں چند قصیدے، قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر ...خباروں وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں غالب ...کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے دلی عہدِ ظفر، میرزا فتح الملک بہادر ...کی مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۴۸ پر ہے ...اس کا مطلع ہے:-

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زخمہ رواں، زمزمہ از تار بر آمد

اس کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفے زلب کافر و دیندار بر آمد
آں از نعم آوازۂ انکار در افگند
ایں راز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:-

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدانِ خویش کہ خرکرّۂ چند بودند، گفت: افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از نعم معنیِ انکار افادہ می کند! حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آلِ نبی یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرح مُلّا کہ رفعِ ایں وسوسہ می کرد، بُوے نمود و گفت: غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدۂ۔ سوال از جانبِ حق نیست: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟ — آیا نیستم پروردگارِ شما؟ و ایں کلمۂ استفہامیہ است۔ کفّار گفتند: ہاں، نیستی خدائے ما! مومناں گفتند: ہاں، ہستی خدائے ما۔ آں تسلیم انکار است و ایں تسلیم اقرار۔ مولوی چوں خَر در وحل فرو ماند۔"

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

بقیہ، غالب کا ایک گمنام شاگرد

آنکھ جس دن سے کھلی محو رخ دوست ہوں میں
میری آنکھیں نہیں واقف، کسے کہتے ہیں خواب
ہے یہاں موسم برسات ہمیشہ طالب
دیدۂ تر میں مرے روکش باراں سیماب

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہر صورت
واں زلف پریشاں ہے یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اس کی۔ نصیب اس کا۔ زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوف عدو دن رات ہم پہلوئے دوست
طالب خلد بریں طالب ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

کس آتشیں نگار کے سوز فراق میں
سرگرم نالہ ہوں شرر افشانیوں کے ساتھ
طالب کیا ہے آہ نے اپنی اثر ضرور
وہ ہیں جو عذر خواہ پشیمانیوں کے ساتھ

یہ سرسری انتخاب ان شکستہ اور کرم خوردہ اوراق کا ہے جس کی ترتیب و تدوین کے لیے اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے! طالب کے نام غالب کا کوئی خط مجھے ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ طالب کے اکلوتے فرزند مفتی سید احمد شریف گہرا دلدمے ان کی وفات کے بعد اس خاندان کا نسلی چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ خاندانی جائداد کے تنازعے شروع ہوئے اور جس کے ہاتھ جو کاغذات لگے اس نے اپنے قبضے میں کر لیے بظاہر ان کے ملنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں پھر بھی سعی و کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔

غالب سے متعلق دو خط

صاحب آب حیات کے نام

(زیر طبع کتاب غالبیّہ سے)

اکبر علی خاں

تذکرۂ آب حیات کا نام جہاں ہمارے ذہنوں میں ایک باغ و بہار، دلکش اور ساحرانہ اسلوب کی تازگی کا اثر بیدار کرتا ہے وہیں تاریخی اعتبار سے اس تصنیف کی اہمیت کو کم اور اس کے مصنف کو پایہ اعتبار سے ساقط بھی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ شاید ہی موجودہ دور کا کوئی نقاد اور محقق ایسا ہو جس سے محمد حسین آزاد کے بارے میں رائے دریافت کی جائے — اور وہ بھی آب حیات کی روشنی میں تو وہ انھیں جانب دار، متعصب اور واقعات کو حسب ضرورت استعمال کرنے والا نہ کہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب تک جن حالات کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا وہ بیشتر آزاد کے خلاف نکلے۔ اس لیے ہمارے نقاد اور محقق آزاد کو مجرم سمجھنے میں بڑی حد تک حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد کی دیانت داری کو مشکوک بنانے میں جہاں اور بہت سی باتیں کام کر رہی ہیں وہاں خصوصیت سے تدوین کلام ذوق کے وقت اصلاح اشعار کا کام بھی ہے۔ بے چارے آزاد نے یہ کب سوچا ہوگا کہ اپنے استاد کے لیے خلوص محبت اور عقیدت میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں عالم آشکار ہو کر رہے گا۔ مگر وقت کی رو بڑی بے درد ہوتی ہے اور آج ہم سب جانتے ہیں کہ ذوق کی تصویر میں کتنے نقوش اصل اور کتنے مصور کا اپنا اضافہ ہیں۔

اسی طرح آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں کا تذکرہ شامل نہ کر کے بھی انھوں نے اپنے آپ کو اعتراضات کا نشانہ بنا لیا۔ کہنے والوں نے کہا کہ مذہبی تعصب کے جنون میں آزاد نے مومن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ لاکھ صفائی پیش کرتے رہے کہ مجھے مومن کے بارے میں سعی و جستجو کے باوجود معلومات نہیں مل سکیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں جب مومن کا ذکر آگیا تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ پہلی بات عذرِ لنگ کے سوا کچھ نہ تھی اور یہ شمولیت مطالبہ جمہور کے ڈر سے ہے۔

یہ اور اس جیسے بہت سے اعتراضات صاحب آب حیات کے سلسلے میں عام ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آب حیات کو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی افسانہ و افسوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا لب و لہجہ، تاریخ اور تذکرے کے مروجہ انداز سے میل نہیں کھاتا اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ زیب داستاں کے لیے صاحب کتاب نے اپنی ذہنی اڑان کو بے دریغ استعمال کیا ہے۔ لیکن کلی طور پر یہ خیال درست نہیں ہے۔ آزاد نے خام مواد کے مہیا کرنے میں مختلف ذرائع استعمال کیے تھے۔ اور غالب و مومن وغیرہ کے سلسلے میں ایسے اصحاب کو خطوط لکھے تھے جو انھیں ان شخصیتوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے تھے۔

اس مسالے کو ڈاکٹر محمد صادق نے دریافت کیا ہے۔ اس میں علاء الدین احمد خاں علائی اور شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی کے دو خط بھی ہیں۔ یہ خط غالب سے متعلق ہیں۔ پہلا خط علائی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے سوالات قایم کر کے بھیجے تھے جن کے جوابات بالترتیب علائی نے لکھے ہیں۔ دوسرے خط میں جو ذکاء اللہ کا ہے باقاعدہ سوال و جواب کا ڈھنگ تو نہیں لیکن ہے وہ بھی آزاد کے استفسار ہی کے جواب میں۔

ان خطوں کے سامنے آجانے سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ آزاد نے حتی الامکان کسی کے بارے میں لکھنے سے پہلے ایسے ذرائع تلاش کیے جن کی طرف انھیں رجوع کرنا چاہیے تھا، اور جن سے صحیح واقعات و احوال کا علم ہو سکتا تھا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں خط موافق و مخالف انداز فکر کی آخری حدوں کو چھوتے ہیں۔ علائی نے غالب کے سلسلے میں جس
یدت اور محبت کا اظہار کیا ہے ذکاء اللہ کے یہاں اس کے برعکس جذبہ نظر آتا ہے اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔
ان خطوں کے ساتھ آب حیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ آزاد نے منفی کے مقابلے میں مثبت اطلاعات کو
ح دی ہے اور غالب کے بارے میں ان تاثرات اور واقعات کا اندراج پسند کیا ہے جو علائی نے لکھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ذکاء اللہ کے
ت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

دراصل یہ طرز عمل آزاد کے مرنجاں مرنج مزاج کا تقاضہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گل کبھی نہ کھلا سکتے جو انھوں نے کاغذ پر بکھیر دیئے
اور جو کاغذ کے ہوتے ہوئے بھی بے رنگ و بو نہیں۔ وہ اگر چاہتے تو جانب داری سے کام لیتے ہوئے مخالف مواد کو بآسانی پیش کر سکتے تھے
انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ہمیں سارے مشکوک مواقع پر جہاں ہم آزاد کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتے ایک بار پھر سوچنا چاہیے
مصنف کو کتنی چھوٹ دے سکتے ہیں

یہ خطوط اگر ایک طرف آزاد کو سنگین الزام سے بری کرتے ہیں تو دوسری طرف غالب کے بارے میں دلچسپ معلومات کے حامل بھی
اور دو قطعاً مخالف سمتوں کی وجہ سے بے حد لائق توجہ بھی۔ ڈاکٹر محمد صادق کے شکریہ کے ساتھ انھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوب نواب علاء الدین احمد خاں علائی

۲۸ جون ۱۸۷۶ء

ادیب شفیق، حبیب لوذعی و العلمی مولوی محمد حسین صاحب عربی پروفیسر کالج لاہور

السلام علیکم! آپ کا مہربانی نامہ ۲۲ جون کا اس دور افتادہ کو ملا۔ اس کا ورود میرے لیے فتح الباب مسرت ہوا۔ آپ کا ارادہ نسبت تالیف
مشاہیر شعرا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس تذکرے میں ہر شاعر کے تاریخی حالات اور اس کی سوانح عمری کے واقعات لطائف اور تلامذہ
کا آپ نے التزام فرمایا ہے اور عنایت الٰہی اس کا تکمیل پر پہنچنا دریافت ہو کر نہایت درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ اگرچہ میں سرمایہ علمی بہت کم
رکھتا ہوں الا ایسے امور کا نہایت شائق ہوں اور افسوس ہے کہ وقت لکھنے اس تذکرے کے میں آپ سے دور تھا۔ ورنہ آپ کو تاریخی حالات
کی نسبت سوائے حالات مرزا اسد اللہ خاں غالب کے زیادہ تر امداد دی جاتی، کیونکہ میں نے اپنے والد ماجد سے بہت کچھ سنا ہے۔ میں
خاکستر ہوں اُس خرمن کا جسے آتش غدر ۵۷ نے جلا دیا۔ اب آپ نے مخدومی مکرمی عمی مرزا غالب کا حال دریافت کیا ہے۔ اگرچہ اس کا
جواب عمومی مکرمی جناب ضیاء الدین خاں صاحب کو حاصل ہے وہ بالاستیعاب ان کے حال سے آپ کو اطلاع دیتے۔ بدیں وجہ کہ وہ مجھ سے
کہن سال بھی ہیں اور ان کی معلومات افہام اوہام کے نزدیک معتمد علیہ اور معتبر تر ہے مگر خیر جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ حوالۂ قلم ہے۔
آپ کو واضح ہو کہ جناب مرحوم سے مجھے تلمذ بھی تھا۔ اور غایت درجہ مہر و شفقت اُن کی میری نسبت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم میرے
کے اور ان کے زیادہ محبت اور مودت تھی۔ اور چونکہ وہ صاحب اولاد نہ تھے مثل فرزند مجھے تربیت کیا۔ میرے علم میں جو کچھ ہے اسے
صاف لکھے دیتا ہوں۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اور راویان صادق کی تحقیق کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

آپ کا سوال نسبت تبدیلی تخلص؟

جواب ــــ مجھ کو یاد ہے فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ میں ۲۹ کے قریب انھوں نے تخلص تبدیل کیا۔ اور واقعی اسد اللہ خاں کے نام کے
غالب ہی تخلص زیبا تھا۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ لقب قرار پا لیا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ نوٹنگا کوڈھبا
کا شعر کہتا تھا اس کے ایک مقطع میں لفظ اسد ان کی نظر سے گزرا۔ وہ مقطع یہ تھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

ہم تخلص ہونا جناب مرحوم کو ایسے لوگوں سے جو تہمت آدم ہیں نہایت مکروہ معلوم ہوا اس وجہ سے اسد اللہ خاں کے ساتھ غالب کو موضوع کر دیا۔

دوسرا سوال بابت مذہب مرزا صاحب و آبائے مرزا صاحب ؟

جواب ـــــ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولاد سلم اور تورسے ہیں اور ترکمان کہلاتے ہیں۔ اجداد ان کے شیعہ مذہب نہ تھے۔ مگر اس ملک کا آدمی اور ترکمان لوگ اکثر تفضیلی ہیں۔ اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر تھی۔ ان کے تزدیک حقیقت خلافتِ امامت کی ثابت ہوئی۔ ماسوا اس کے کثرت صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین معروف کے ساتھ اور بخشی محمود رضا خاں کے ساتھ اسی امر کی باعث ہوئی کہ وہ علی پرست ہو گئے۔ اور غلو ان کا ہنگام مباحثہ تھا نہ یہ کہ وہ تبرائی ہوں۔ بزرگوں میں مرزا صاحب کے کسی کو ہم کیش مرزا نہ سُنا۔

تیسرا سوال کہ کس سنہ میں شعر کہنے شروع کیے ؟

جواب ـــــ سنہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر عنفوان جوانی سے طبیعت نے راہ ذی اور یہی مشغلہ رہا۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔

چوتھا سوال ہرمز و عبد الصمد کا معاملہ ؟

جواب ـــــ آپ کی زبان سے میں نے اکثر سنا تھا کہ وہ ان کا استاد تھا۔ وہ تاجر تھا۔ ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے اپنگاہ بنایا تھا۔ پس اگر مرزا صاحب جھوٹے تصور کیے جائیں تو یہ روایت بھی بے اصل محض ہے۔ اور جب یہ روایت بے اصل ہے تو پھر القا اور الہام کو ماننا پڑے گا۔ ایسا متعلم سوائے سروش غیبی کے کیسے فیض پذیر ہو سکتا ہے۔

پانچواں سوال کتب مصنفہ کی تدوین ؟

جواب ـــــ دیوان فارسی ۱۸۳۳ء، ۱۸۳۵ء میں ترتیب ہو گیا۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں وہ الواح طبع سے مل سکتا ہے دیوان اردو ۱۸۴۹ء کے بعد ترتیب پذیر ہوا۔ مہر نیمروز شاید ۱۸۵۱ میں شروع ہوئی۔ اور اسی ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۱ء میں شرف بار پائی۔ ارک پایا اور حکیم احسن اللہ خاں کے تقاضے سے تاریخ نگاری شروع کی ورنہ بادشاہ ایسے اشتیاق و اشتغال سے مبرا تھے۔

چھٹے سوال کا جواب بھی اسی پانچویں میں آگیا۔

ساتواں سوال۔ کلکتے میں طرح باد مخالف اور اس کی وجہ ؟

جواب ـــــ اہل پورب اور بنگالہ بوجہ بے مذاقی کے قتیل پرست اور مادھو رام ستای ہیں اور مرزا صاحب کو اہل ہند کی نسبت کلام رہا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اس شعر سے مستفاد ہے۔ شعر :-

لیک نا ید زمن کہ در گفتار مدحت لالہ سور داس کنم

اور باعث اس تفضیح کے چند بے تمیزانِ کلکتہ ہوئے، کہ وہ لوگ آداب مہمان نوازی اور مہر شناسی سے عاطل ہیں۔ بجائے تکریم ضیف تسویم و تضحیم ضیف کی گئی۔ اس تقریب کے باعث مولوی عبد القادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگِ کلکتہ تھے اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے۔ ترتر مکان صاحب نے شاہنامے کی تصحیح کہ گویا جس کو تفضیح کہنا چاہیے ان دونوں صاحبوں کے واسطے سے کی تھی۔ بجملہ اس بنا پر باد مخالف لکھی گئی۔

آٹھواں سوال۔ نواب مصطفےٰ خاں کو ہدایت غلبی ؟

جواب : حالت غلبی رفیق حال ہوئی مگر حالت شیبی سے پہلے رنگ جما ہوا تھا۔ اگر رم جو منہیات میں داخل نہیں ہے تو بنت العنب سے مضائقہ نہ کیجیے۔ شعر :-

ہو گی چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتے تھے روز ابر و شب ماہتاب میں

مگر ہاں میاں انصاف کہ میاں عبد الغنی صاحب سے خانقاہ میں جب تجدید بیعت کی اور خود بھی کسی قابل نہ رہے تو توبہ کامل حاصل ہوئی

رشاید پاس داشت حدیث خوانی ملحوظ خاطر اسلام شکوہ رہا ہو۔

نواں سوال۔ مولوی الطاف حسین حالی کی روایت ؟

جواب ـــــ واقعی مرزا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ وقتِ اشارات و معنی و غرابت ترکیب ہم اردو میں نہ کرتے اگر طباع فہام کو ایسا ناقص جانتے۔

محبا! میں احباب کی خدمت گذاری کو عموماً حاضر ہوں، اور آپ کی اس مہجور پرستی کا شاکر۔ جب کام ہو تو آپ ارقام فرمائیں اس کا سرانجام میرے لیے سرمایہ مسرت ہے۔ مگر اس معاملہ خاص میں باہمہ بے بضاعتی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ امر بے ملاقی ممکن نہیں۔ اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیف شریف کے یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید آپ کو اس میں جائے انکار۔ ریواڑی سے لوہارو تک میرے ہاں کی سواریاں حاضر ہو سکتی ہیں۔ اور لاہور سے ریواڑی تک ریل کی سبیل ہے ایدہ السلام والاکرام میں ناتندرست ہوں۔ ورنہ اپنے ہاتھ سے لکھتا۔

المعذور معاف علاء الدین

مکتوب شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی

جناب من!

جب مجھے آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شایع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو بندے سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں وہ فی مافی کرنے کو تیار ہوں گے اس لیے ایک عذاب جان بن جائیں گے۔

اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ "صہبائی شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں نہ جیل خانے میں پڑا"۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس جگہ بیچتا تھا۔ اس لیے قصاید میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے۔ بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں سیزدہم۔ دہم۔ نہم۔

میرے نزدیک فقط اُس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں۔ وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں میں۔ غالب کا خود قول تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا دو شاعر ہوئے ایک غالب اور دوسرا خسرو۔

ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا۔ اس نے ایک دفعہ دیکھ کر واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ "دریں خرافات اوقات ضایع نکنیم، ما نمی دانیم کہ در کدام زباں ایں دیوان گفتہ شدہ است"۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی جو عیسائی ہو گیا تھا۔ جان مور نام رکھتا تھا۔ وہ ذوق مرحوم کے پاس جاتا تھا وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے پوچھتے تھے۔ وہ فوراً معنی بتا دیتا اور محاورہ کی ایک دو غلطی۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم و نثر اُس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یافتوں کو سوجھتا ہے اور منشی اور دبیر جو پہلے زمانے کے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غالب کی مثنوی بے نام کا نام

سید مرتضیٰ حسین فاضل

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کا تذکرہ کرتے ہوئے نو کتابوں کے نام لکھے، گل رعنا میں وہی نام نقل کر دیے گئے۔ مولانا حا
نے سب سے پہلے غالب کی تصنیفات، و تالیفات کا ضمنی و سرسری جائزہ لیا، مگر ان کا موضوع نہ سوانح تھا نہ تاریخ، اس لیے تالیفات کی تحقیق اور ان
بارے میں تفصیلات بھی بنیادی طور پر پیش نظر نہ رہے لیکن ان معلومات کے ماخذ اولین میں جہاں اور بہت سی کام کی باتیں ہیں وہاں دو ایسی کتابوں
کے بارے میں اشارے بھی ہیں جن کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو مولانا کا یہ کہنا:

"چند اجزاء ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔"

(ص ۱۵۷، یادگار غالب)

دوسرے یہ تحریر کہ:

"بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالباً "دَمغُ الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا، اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی، بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔"

(یادگار غالب ص ۷۰)

ابھی تک "ناتمام قصے" کے تفصیلات تو معلوم نہیں ہو سکے، مگر مذکورہ بالا مثنوی پر کنجکاوی منزل تحقیق تک پہنچ گئی۔

حالی کے بعد جناب مہر صاحب نے سوانح و سیرت غالب کی طرف پوری توجہ کی، لیکن "غالب" طبع اول (نیز بعد) میں "مثنوی دعائے صباح" کی طرح اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا، جناب اکرام صاحب نے غالب نامہ طبع دوم ص ۶۰ حاشیے میں اس مثنوی کے دو شعر لکھے مگر نام نہ لکھا، پھر ص ۶۲ پر لکھا:

"اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ، مرزا سے دفع الباطل (کذا) کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا"

پھر چوتھے ایڈیشن میں غلطی طباعت کی اصلاح فرمائی گئی اور ص ۱۲۱ پر "دمغ الباطل" لکھا۔ مالک رام صاحب اس سلسلے میں خاموش ہیں اور کوئی نام نہیں بتلاتے، مسعود حسن رضوی صاحب نے "متفرقات غالب" میں یہ مثنوی شائع کی تو ان کے سامنے رسالۂ علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری" تھا، اور نام کی تحقیق، حالی کی غلط فہمی پر بحث بھی فرمائی لیکن اسے "بے نام مثنوی" ہی قرار دیا۔

میں نے ۱۹۴۶ء میں "رسالہ علم حیدری اور مثنوی شوکت حیدری" صفی دار المطالعہ لکھنؤ میں دیکھی اور مثنوی تو پوری نقل کی لیکن نثر کے رسالے کو نقل کرنے اور نوٹس لینے کی باری نہ آسکی، مگر زیر بحث مثنوی کا نام لکھ لیا۔ پاکستان آنے کے بعد بارہا ارادہ کیا کہ اس سلسلے میں کچھ لکھوں مگر ماخذ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہمت نہ پڑی، بعض احباب کو ضرور بتا دیا تھا۔ حبیب محترم جناب خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی نے چند وقیع کتابیں عاریت دیں جن میں، رسالہ علم حیدری، مثنوی شوکت حیدری، مثنوی شیعیان علی بھی ہیں۔ اس درمیان جناب اکبر علی خانصاحب نے فرمائش مضمون فرمائی۔ ہم نے اس مضمون میں ان تینوں کتابوں کے پہلے مطبوعہ لکھنوی نسخوں ۱۲۷۰ھ کو سامنے رکھا ہے۔

جناب مسعود حسن صاحب نے مثنوی کے بارے میں بڑی کارآمد بحث فرما کر اس سلسلے کی اکثر مثنویوں کے نام اور صحیح تفصیلات لکھی

ہیں۔ لیکن جناب امداد صابری نے "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا" میں، ایک اور ہی قصہ لکھا، "غیر ملک سے انگریزوں کے خلاف مدد لینے کی سعی" کے عنوان سے فرماتے ہیں:

"۱۸۵۱ء میں مرزا حیدر شکوہ ..... اور واجد علی کے قابل اعتماد مانے جاتے تھے، جن کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا، اور واجد علی شاہ کے ہم مذہب یعنی شیعہ بھی تھے۔ ان سے بہادر شاہ کی گفتگو ہوئی، اور جو حرکتیں بہادر شاہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے مرزا حیدر نے بادشاہ کو مشورہ دیا، کہ ہندستان میں اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لیے واجد علی شاہ سے یک جہتی اور رابطہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں متحد ہو کر اور طاقت ور بن کر شاہ ایران کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور بقول حکیم احسن اللہ خاں ان سے مل کر اپنا ملک فتح کر لیں۔

بہادر شاہ کو یہ طریقہ پسند آیا، اس پر غور کیا گیا کہ اتحاد کا طریقہ کیا اختیار کیا جائے، مرزا حیدر کی رائے ہوئی کہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جائے گا تو واجد علی شاہ اور شاہ ایران پر بھی اثر پڑے گا اور آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جائیگا"

انگریزوں کی مخالفت کے لیے شیعہ بننے کا اعلان

بہادر شاہ ظفر، انگریزوں سے انتہائی برگشتہ اور نالاں تھے۔ انھوں نے بغض معاویہ کے جذبہ میں آکر اعلان لکھ کر مرزا حیدر کو دے دیا، کہ میں نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے، مرزا حیدر نے اس کو لکھنؤ میں جا کر مجتہد العصر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ خبر لکھنؤ کے ہر محلے اور ہر بازار میں پھیل گئی۔ لکھنؤ والے بہت خوش ہوئے لیکن دہلی والوں میں کھلبلی مچ گئی کہ انھوں نے اس مصلحت وقت کو مذہب کے مقابلے میں کیوں اہمیت دی بالآخر بادشاہ نے اپنے انکار کی تصدیق میں ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت" مرتب کی اس پر مرزا غالب نے بادشاہ کو اس اتہام سے بچانے کے لیے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا۔"

(کتاب مذکور طبع دہلی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۷ ببعد)

مجھے اس عبارت سے بحث نہیں، اگرچہ امداد صابری نے "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" اور مولانا حالی کی یادگار غالب کا حوالہ دے کر یہ سب کچھ لکھا ہے مگر یہ ضرور عرض کرنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں۔ بلکہ یہ ہنگامہ دسمبر ۱۸۵۳ء سے جنوری ۱۸۵۴ء کے درمیان میں شروع ہوا، اور حالی سے آفاق تک سب نے اس کی صحیح وجہ بادشاہ کی بیماری و صحت یابی ہی بتایا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت آنے والے معاصر بیانات و دستاویزات کی بنا پر مشتبہ، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غلط ہو جائے گی تو شاید بے جا نہ ہو۔

مثنوی "دمغ الباطل" نہیں "کلمات طیبات" ہے جس کی تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ بادشاہ ۸ر جولائی ۱۸۵۳ء عید ۱۲۶۹ھ (غالباً) میں بیمار ہوئے، دوران علالت میں مرزا ملازمت دربار کی وجہ سے قلعے جاتے اور مزاج پرسی کے لیے بھی حاضر ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کو علالت کے تفصیلات سے براہ راست علم تھا، مگر انھوں نے زیادہ تاثر کا اظہار نہیں کیا صرف منشی بخش حقیر کے نام جو خطوط ہیں، ان میں ذرا مفصل حال ملتا ہے، اور وہ بھی کسی گہرے تاثر کی نشان دہی نہیں کرتا، مثلاً ۲۱ر اگست ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہیں:

"بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو، اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں دست موقوف ہو گئے، مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں، تپ جاتی رہی، مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے، ہچکی اس شدت کی نہیں رہی، گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں، اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں، اس ہئیت سے برآمد بھی ہوتے ہیں، قلعے ہی قلعے میں پھر کر، پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجیے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے، بہر حال جب تک سلامت رہیں غنیمت ہے۔" (۱۶ر ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ، بروز یکشنبہ)

۲۹ر ذی الحجہ، ۲ر اکتوبر کو لکھتے ہیں:

"اب سنتا ہوں کہ حضور، بعد محرم جشن غسل صحت کریں گے۔"

۲ر محرم، ۶ر اکتوبر کو لکھا:

"بعد محرم سنا جاتا ہے کہ جشن غسل صحت ہوگا۔ بادشاہ اچھے ہیں رہا ضعف، وہ لازمہ عمر ہے۔"

مرزا کے ان خطوں سے بادشاہ کی بیماری کا ایک ہلکا سا خاکہ، اور تھوڑے تفصیلات معلوم ہوئے۔ رسالہ علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری" کے مؤلف محمد حیدر شکوہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ ان دنوں بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جسے خود بادشاہ کی لفظوں میں سنیئے،

"نور چشم راحت جان، مرزا حیدر شکوہ بہادر مورد تفضلات بودہ بدانند کہ ہر دو علم، صرف از اعتقاد غلامان غلام جناب حضرت علم دار گذرانیدہ ام، اگر قبول افتد زہی عز و شرف۔ از طمع دنیا دران نہ پیوادکذا) و نمی فہم، صرف برائے آسودگی دین، کسی نمی داند کہ عنایت چہ قدر بریں احقر شدہ، چند بار بزیارت شدہ (کذا) قابل اظہار نیست، الا بروقت ملاقات خود ماخواہیم فرمود۔ ہر شخصے کہ از اہل بیت حسد می داشت بر دلعن مدام بادبیش باد، ایں ایمان است فقط۔"

اس خط کے بعد حیدر شکوہ کلکتے سے دہلی آئے اور دربار میں حاضر ہوئے، تو بادشاہ نے اپنے خواب کا بیان اور "تقسیم علم بنائے تعزیہ خانہ" (علم حیدری ص ۳) کا تذکرہ کیا اور جناب سلطان العلماء کے نام ایک خط مرحمت فرمایا، علم مرزا محمد نور الدین حیدر بہادر کے ہاتھ لکھنؤ بھیج چکے تھے حیدر شکوہ لکھنؤ آئے اور ۶ ربیع الاول کو وہ علم شاہی اہتمام سے "درگاہ" میں تذر کیا گیا۔

مثنوی شوکت حیدری میں "آغاز ماجرا" یوں ہے:

رہ دین چو دریافت آن بادشاہ — طلب کرد مارا بصد عز و جاہ
مرا بسکہ با خویش ہمزاد دید — ز حضار بدکیش خلوت گزید
چو محفل تہی شد، ز ہر ہر من — بہ فرمود از من دران انجمن
کہ یک روز در خواب نوشین ما — ہدایت کن دین و آئین ما
درآمد، علمدار سبط نبی ص — مسمّیٰ بہ عباس ابن علی رض
بہ تلقین زبان ہدایت کشود — مرا در غلامان حیدر رض نمود
بہ تعبیر آن گشت چون اہتمام — ہمان وقت با اعتقاد تمام
بہ آل محمد ص تولد نمود — ز اعدای آنہا تبرا نمود
بہ شکریۂ آن علم ساختہ — زمانی چو افسر بہ سر داشتہ
فرستاد، در لکھنؤ بادشاہ — پئے نذر درگاہ عرش اشتباہ
دگر شقہ خاص خیر اکتساب — بنام جناب ہدایت مآب
بہ علم و عمل مقتدای انام — سمیّ محمد علیہ السلام
بہ ما مرحمت گشت و از دست ما — رسیدہ بہ درگاہ آن مقتدا
چو در لکھنؤ آمدم از حضور — فریبی نمود و نداصحاب زور
چنان طبع را منحرف ساختند — کہ بر کردۂ خود نہ پرداختند
چو آن قوم بدکیش ناچار کرد — ز ارسال و اصدار انکار کرد
چو توقیع شاہی غلط ساختند — بنام من این قرعہ انداختند

مثنوی شوکت حیدری ص ۵ ببعد

یہ علم ۶ ربیع الاول ۱۲۷۰ھ کو شاہی جلوس کے ہمراہ سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب کے ہاتھوں درگاہ حضرت عباس واقع کشمیری محلہ لکھنؤ میں نصب کیا گیا اور وہیں مجلس میں مرزا نور الدین نے بادشاہ کے نام سے مرثیہ پڑھا۔

شاید اس سلسلے میں اشتہارات و اعلانات کے علاوہ افواہیں بھی پھیلی پھیلائی گئیں۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ اکابر علماء دہلی نے بادشاہ سے ان کے عقاید اور تبدیلی مذہب کے بارے میں باز پرس کی تو بادشاہ نے اپنے سنی ہونے کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا کہ "علم" اور مرثیہ کا قصہ میرے اوپر بہتان ہے، یہ سب کچھ مرزا نورالدین اور محمد حیدر شکوہ نے کیا اور میرے سر تھوپ دیا۔

بظاہر اس سلسلہ میں تین اقدامات کیے گئے، ایک تو یہ کہ بادشاہ نے "امین الدولہ سمین فریزر بہادر، دلیر جنگ، صاحب اجنٹ شاہ جہاں آباد کو ایک خط لکھا:

"امارت و ایالت مرتبت، عمدۂ امرای نامدار، زبدۂ عقلای باوقار، خیراندیش، دولتخواہ بلا اشتباہ، فدوی خاص بعقیدت اختصاص، لایق العنایتِ والاحسان!

بتفضلاتِ بادشاہی مباہی بودہ بداند! دریں ایام بملاحظۂ قطعات سوالات علما و مشائخ این شہر بوضوح پیوستہ کہ از روی اخبار و خطوط لکھنؤ بدر یافت این مردم رسیدہ کہ بتاریخ ششم ربیع الاول مرزا حیدر شکوہ بہادر، و مرزا نورالدین بہادر شیعی مذہب، میرگان مرزا سلیمان شکوہ بہادر، در لکھنؤ علمی بکمال تجمل بہ ہمراہی عمائد آن شہر برداشتہ بدرگاہ حضرت عباس بردند۔ و فضیلت پناہ، سیادت دستگاہ سید محمد، مجتہد مذہب شیعہ، بدست خود علم مذکور را در درگاہ نصب نمودہ۔ و مرزایان مسطور بہ نسبت ابلاغ آن علم بہ بندگانِ والا کردند۔ و نیز، مرزا نورالدین بہادر بر منبر برآمدہ مرثیہ بزبان اردو کہ متضمن بی ادبی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بودہ در مجمع کثیر بآواز بلند برخواندہ، در مقطع آن مرثیہ تخلص حضور پر نور درج کردہ و قطعۂ شقۂ مہری خاص مشعر ترک کردن مذہب اہل سنت و جماعت و اختیار نمودن مذہب اہل تشیع و وثوق ارادۂ تعمیر امام باڑہ و اختیار تعزیہ داری بر دوام موسومہ مجتہدِ مذکور ظاہر ساختہ، بندگانِ والا را باتہام مذہب رافض متہم و بدنام ساختند

و چون این ہمہ غلط و بی اصل و محض افترا و بہتان است، زیرا کہ بعنایت الٰہی در عقیدہ راسخہ حضور کہ آن بطریق اہل سنت و جماعت است، ہرگز فتور و فساد راہ نیافتہ۔ و کدام مرثیہ محتوی مضمون سب و طعن نسبت بخلفائے راشدین، کہ اساطین دین و مقتدایان اہل یقین اند، بر زبانِ الہام بیان نہ رفتہ، و شقۂ خاص باشعار امور خلاف شرع بنام مجتہد مذکور ہرگز ریختۂ کلک گوہر سلک نگردیدہ این ہمہ تصنع و دروغ آرائی مرزایان مذکور است کہ بحضور پر نور منسوب کردہ اند۔

و لیکن بیاد می آید، کہ ایشان ہنگام حضوری خود دریں جا، این معنی بطریق حکایت و تذکرہ معروض داشتہ بودند کہ موافق مذہب خود برای حصول صحت بندگان والا، نذر قرار دادہ ایم کہ بروقت غسل صحت حضور از طرف خود علمی طیار ساختہ، در شکریۂ صحت حضرت اقدس بدرگاہِ حضرت عباس خواہیم داشت، سوای این ہیچ مذکور نہ کردہ بودند، و نیز اکثر شقہ جات در مقدمۂ ذاتی خود ہا مسجل کنانیدہ بودند و لیکن بنام فضیلت پناہ مذکور کدام تحریر کہ بہ مہر خاص مزین باشد ہرگز بوقوع نیامدہ شاید مرزایان مسطور بنام کدام مصلحت و منفعت خود این افترا بر حضور کردہ باشند و تحریری بی اصل و باطل مرتب کردہ دادہ باشند و مجتہد مذکور بمقتضای نیک نہادی خود آں را در پایۂ صدق دانستہ شہرت دادہ باشند دریں صورت ملاحظۂ آن شقہ کہ نزد آن سیادت دستگاہ رسانیدہ اند ضرور تر افتادہ، تا معلوم شود کہ مضمونش چیست، و نگارندہ اش کیست۔ و بعد دریافت این حال تدارک انسداد رخنۂ این فساد بطرز مناسب بعمل آید کہ بار دیگر کسی جرأت این افترا پردازی بہانہ گردد۔

لہذا، زیب ارقام می باید کہ آن امارت و ایالت مرتبت بمقتضای دولت خواہی و خیراندیشی بہ جہت رفع این اتہام و بدنامی بندگان اقدس خط انگریزی خود بنام اجنٹ بہادر لکھنؤ بمزید تاکید بنگارد کہ شقہ جعلی مہری خاص از مجتہد مذکور بہر نوع کہ تواند طلبیدہ زود تر ارسال دارد۔

ہر آئینہ این معنی موجب استرضای خاطر عاطر خواہد شد ـــــ زیادہ بتفضیلات شناسد۔ فقط"

سلطان العلماء نے اس کے جواب میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو ایک خط بہادر شاہ کو لکھا جس کا متن علم حیدری ص ۷ پر درج ہے خلاصہ یہ ہے:

"آپ کے آباؤ اجداد شیعہ[1] تھے۔ آپ کے سابقہ خط نے اس کی تائید مزید کی تھی، لیکن جس طرح بادشاہ عفران پناہ، بہادر شاہ، طاب ثراہ کو اعلان تشیع کے جرم میں شہید کیا گیا[2]۔ اسی طرح جناب والا کے اس اقدام کے بعد ہنگامے کھڑے ہو گئے اور دشمنوں نے یہ چاہا کہ آپ کا نام بھی خطبے سے نکال دیں۔ عین اسی عالم میں آپ کے خط کی نقل اجنسٹ کے نام آئی مجھے پڑھ کر حیرت ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سابقہ خط میں فریب کا امکان ہے۔ اسی طرح اس خط کو تقیہ پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ خط جعلی ہے؟ اس کا جواب مرزا محمد شکوہ بہادر اور مرزا نور الدین صاحبان سے ہے۔ ان کے خطوط آ رہے ہیں اور چونکہ اس سلسلے میں تحقیق ہو رہی ہے، اس لیے اصل تحریر تو ابھی واپس نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بعد تحقیق جس طرح میں جناب والا کا خط واپس کروں گا، یقین ہے جناب والا بھی میرا جواب واپس کر دیں گے۔

اس کے ساتھ ہی سلطان العلماء نے رزیڈنٹ کو اسی قسم کا جواب لکھا، مرزا حیدر شکوہ نے بھی رزیڈنٹ کو اپنے آباء اجداد کے شیعہ اور حالت تقیہ میں ہونے کا ذکر کرتے ہوئے حقیقت واقعہ لکھی، جس کے بعد فیصلہ الٰہی کے حق میں ہوا، کچھ دنوں کے بعد ایک رسالہ "بطور اعلام از طرف بادشاہ جم جاہ و چند اشعار، بطور مثنوی بزبان فارسی با مدراج تخلص بادشاہی کہ متخلص بہ ظفر اند ــــ کلمات طیبات ــــ مخاطب ساختہ طبع کنانیدہ، جا بجا مشتہر" کی گئی"۔ (علم حیدری ص ۱۲ سطر ۴ ببعد)

(۲) رسالہ کے آخر میں ص ۲۰ پر ہے" مثنوی شوکت حیدری در جواب کلمات خبیثات خوارج دہلوی" پھر علی بخش کے مطبع کی چھپی ہوئی اٹھارہ صفحات اور ۱۶۲ شعروں کی مثنوی ہے، اسی مثنوی کے ص ۱۸ پر مصنف کا قطعہ تاریخ ہے۔

ازین نظم حق، مفتری شد ذلیل — بر اوج مراتب شدہ مثنوی
ز دہلی چو نظم دروغ آمدہ — کہ آن پر معایب شدہ مثنوی
چو حق بود سویم، نوشتم جواب — بر و این عجایب شدہ مثنوی
شدہ غالب کل غالب معین — بر ان نظم غالب شدہ مثنوی

ان طویل اور مفید اقتباسات سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ چونسٹھ شعروں کی وہ مثنوی جسے متفرقات غالب میں شایع کیا گیا ہے۔ اس کا نام "کلمات طیبات" تھا، اور غالب نے بادشاہ کے نام سے کہی تھی:

بوظفر، ملک و دیں خدا داد است — داد خواہیم و کار با دادا ست

اور وہ "اعلام نامہ" جس کا ذکر حقیر کے نام مرسلہ خط میں ہے:

"وہ مثنوی اور اعلام نامہ میں نے تمہارے پاس بھجوا دیا ہے"۔ (نادرات ص۔ ۵ حصہ مکتوبات)

مثنوی سے جداگانہ چیز ہے۔

اس پوری بحث کے بعد یہ آہنگ طبع دوم دہلی ص ۴۲۲ اور طبع نول کشور طبع سوم ص ۲۲۸ کا وہ بے تاریخ خط بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور یقینی طور سے اس کی تاریخ بھی معین کی جا سکتی ہے جس میں مرزا نے انتہائی عاجزی و شرمندگی کے ساتھ "مجتہد العصر، سلطان العلماء، مولوی سید محمد صاحب" کو اس مثنوی کی معذرت میں جواب دیا ہے:۔

---

[1] یہ بات درست نہیں ہے اس خاندان میں بہادر شاہ اول کے علاوہ کوئی بھی بادشاہ شیعہ نہیں ہوا۔ (نگار)

[2] یہ بھی خلاف واقعہ ہے۔ بہادر شاہ طبعی موت مرے ہیں اور طویل عمر پائی تھی۔ (نگار)

"داد آنست کہ اگر ازیں پرسش باندازِ باز پرس بودی ہم راہ سخن بر من فرو بستی، و لرزہ پیکرِ مرا خرد در ہم شکستی، چون از روی مہر دآزرم است، چرا نہ گویم، و اگر گویم ہم از من بر من ستم رود، و در انجمن گفتہ شود، کہ ــ فلانی در گناہ دلیر است و در پوزش ناپروا ــ زبان سخن سرای آلۂ گہر سفتن است، نہ ساز آہنگ ناسزا گفتن۔ نمی گویم کہ بد گفتن گناہ نیست و ہمی گویم کہ گناہ من جز پذیرفتن فرمان شاہ نیست۔ تا دریں ناخوش ہنگام و نا روا ہنگامہ دیگر چہ فرماں رود۔

راست می گویم و یزداں نہ پسند و جز راست حرف ناراست سرودن روش اہرمن است

در نگارش مثنوی، مضمون از خسرو است و لقط از من، چنانکہ در راہش زخمہ از مغنی و صدا از تار۔ و نشگفت، کہ بایں ہمہ ہمہ از زبان من نبود و دیگراں مصرعی چند افزودہ باشند"

قطع نظر اس سے کہ خط کس قدر دل کش عبارت، اور کیسے پیارے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ ہمیں مرزا کے نفسیات، بادشاہ سے مرزا کا قلبی تعلق، سلطان العلماء کی تحقیق و تفتیش کے علاوہ بالکل نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ "کلمات طیبات" میں کوئی اور شخص بھی سلجھے دار ہے۔

---

۵ نگار کو فاضل صاحب سے اختلاف ہے اس لیے کہ غالب نے "مصرعے چند افزودہ باشند" کہا ہے جس میں احتمال پایا جاتا ہے یقینی طور پر کہنے کی جرأت انھیں بھی نہ ہوئی ممکن ہے مختلف مصالح سے انھوں نے یہ جملہ لکھا ہو اور حقیقت حال اس کے قطعاً خلاف ہو غالب کے مزاج کے پیش نظر قرین قیاس ہے۔

جیٹر غالب سے چلی جائے

غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دل چسپ انداز سے پیش کرنیوالی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے ــ قیمت ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

جی ہاں آگ میں پھول بھی کھل سکتے ہیں!

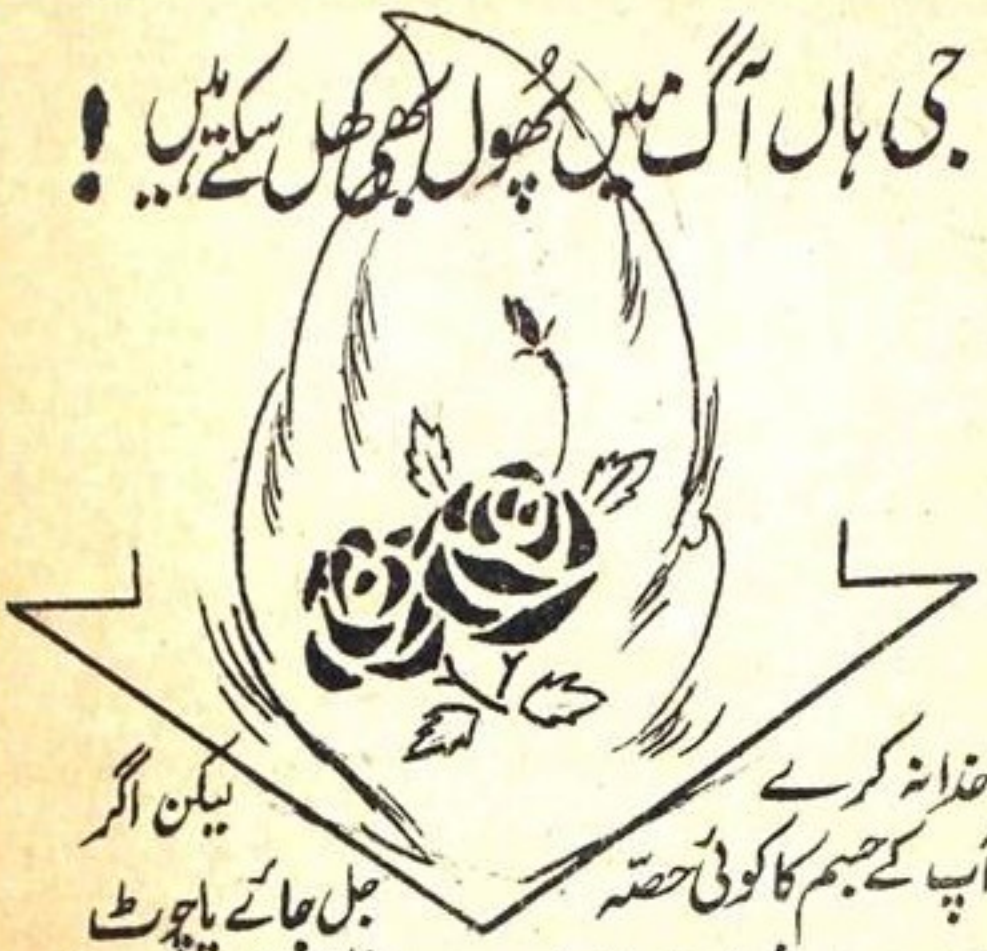

خدانہ کرے آپ کے جسم کا کوئی حصہ جل جائے یا چوٹ آجائے یا خراش پڑ جائے تو جلن اور سوزش کی یہی کیفیت ہوتی ہے جیسے آگ ہو اس موقع پر فوری

FOR BURNS

جلمار کا استعمال کیجئے جو آپکی اس آگ میں پھول کھلا دیگی۔

SCALDS & ABRASIONS USE

JALMAR

& CIPLA product

بنانے والے:

سپلا لیبارٹریز بمبئی ۸

مزاح:

غالب انڈ گوئٹے

حاجی لق لق

مجھ سے روایت کیا کامریڈ باری علیگ نے اور انھوں نے سُنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سُنائی آپ بیتی اور اب آپ مجھ سے سنیے "مرزا بیتی" میرے الفاظ میں اور اس کا ثواب پہنچایئے غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجیے میرے حق میں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے ان ایّام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانے میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کچھ روپیہ مجھے بطور قرض دے دیں یا کسی دوست سے دلا دیں تو میں اٹلی پہنچ کر تھوڑے ہی عرصے میں یہ قرض چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا "قرض؟ سردار صاحب! یہاں پردیس میں کون ایسا ہندستانی فارغ البال ہو سکتا ہے جو اپنے اٹلے تلّوں کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے؟"

سردار جی: "مجھے کوئی زیادہ روپیہ نہیں چاہیے۔ صرف ....."

مرزا صاحب: (بات کاٹ کر) "اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔"

سردار جی: (مایوسی کے لہجہ میں) "تو پھر کیا کیا جائے؟"

مرزا صاحب: "کیا کیا جائے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

سردار جی: (پُر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) "وہ کیا، وہ کیا؟"

مرزا صاحب: "وہ یہ کہ ہندستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ جو بہت آسان کام ہے۔"

سردار جی: "وہ کیسے؟"

مرزا صاحب: "میں کل بتاؤں گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے۔"

سردار جی کی آنکھیں ان الفاظ کو سن کر چمک اٹھیں اور آپ مرزا صاحب کا "پیشگی" شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی۔ اور دوسرے دن وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہوہ خانے میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے اور قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے:-

مرزا صاحب: "دیکھیے سردار جی! مرزا غالب ہندستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے؟"

سردار جی: "وہی نا۔ جنہیں انڈین شکسپیئر کہتے ہیں؟"

مرزا صاحب: (مسکراتے ہوئے) "نہیں نہیں۔ انڈین شکسپیئر تو آغا حشر کاشمیری مرحوم تھے جو مشہور ڈراما نویس تھے۔ غالب ان سے بہت پہلے عہدِ مغلیہ میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسد اللہ خاں تھا اور وطن دہلی۔ آپ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگ دستی میں گزری، آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اس لیے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔"

سردار جی: "بالکل میرے چچا ہرنام سنگھ کی طرح، ذیلدار تھا۔ دو سو بیگھہ زمین تھی، ضلع بھر میں عزت تھی۔ لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اُدھار نہیں دیتا۔"

مرزا صاحب: "ہاں ہاں بس غالب کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن تھا خوددار، مرتا مر گیا لیکن اُمرار کے سامنے نہ جھکا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ..."

سردار جی سر تو ہلاتے جاتے تھے لیکن دل میں سوچتے تھے کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غالب کا قصہ کیوں چھیڑ بیٹھے؟ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے سنتے جایئے۔

مرزا صاحب: "غالب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انھوں نے دہی زما

یا جو جرمنی کے فلاسفر شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی.....۔"

مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی: "لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔"

مرزا صاحب: "بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ نے سنتے جائیے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مؤرخ، شاعر اور ادیب ہیں۔"

سردار جی: "میں اور شاعر؟"

مرزا صاحب: "بس آپ چپ رہیئے، اور میری بات سنیئے، آپ اتوار کے دن "ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ فرمائیں گے۔"

سردار جی: "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔ اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔"

مرزا صاحب: "آپ اردو زبان میں، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جائیے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں تو ان کا نام تو چنداں مشکل نہیں۔ ذرا کہیے تو۔"

سردار جی: "غالب گوئٹے ——— غالب گوئٹے۔"

مرزا صاحب: "بالکل ٹھیک! آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ "غالب اینڈ گوئٹے" کہیے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں، جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے۔"

سردار جی: "غالب انڈ گوئٹے ——— غالب انڈ گوئٹے۔"

مرزا صاحب: "واہ وا۔ خوب! اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہو گا کہ ہندوستان کے مشہور اسکالر سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن بوقت شام ہومبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہو گا وغیرہ۔"

سردار جی: "لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟"

مرزا صاحب: "جو جی میں آئے کہتے جائیے۔ بس بولتے جائیے اور ہر تین چار جملوں کے بعد "غالب انڈ گوئٹے" کہتے رہیے۔"

اتوار کی شام آ پہنچی۔ ہومبرگ ہال جرمن "اہل ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہر ادبیات جلوہ افروز تھے۔ ان کے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آ گیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے صاحب صدر نے اٹھ کر حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا۔ جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی:۔

"صاحبان! مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی کے رہنے والے تھے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اس لیے ان کی عمر تنگدستی میں گذری۔ دہلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے۔ وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے۔ چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں۔ ——— غالب انڈ گوئٹے!"

مجمع نے پرزور تالیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی، تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دہلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں۔ اس لیے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گورو مہاراج کی کرپا ہے۔ نہر میں بھی پانی خوب رہا اور بارشیں بھی اچھی ہو گئیں، امید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ، چڑیا گھر، عجائب گھر ——— غالب انڈ گوئٹے!"

پھر تالیوں سے فضا گونج اٹھی اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار مار کر مقررہ کی "جادہ بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی تو ذرا زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا:

"غالب انڈ گوئٹے کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے شری دربار صاحب امرتسر کے درشن نہ کیے حتیٰ کہ وہ ضلع گورداسپور بھی نہ جا سکے، ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انھیں نانی یہنے میں یاد آجاتی۔ ضلع امرتسر میں ایک گاؤں چمیاری ہے۔ وہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں، قصور کی میتھی بہت خوشبودار ہوتی ہے اور پھر غالب انڈ گوئٹے کے کیا ہی کہنے ہیں گویا انڈیا انڈ جرمنی!"

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب انڈ گوئٹے" پر "انڈیا انڈ جرمنی" کا اضافہ کر کے کمال کر دکھایا۔ اور ان الفاظ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی اور دو تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا کہ :۔

"صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنیئے"۔

اس مقام پر مرزا کاظم نے اٹھ کر حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنے مخصوص قومی انداز میں یہ گانا شروع کر دیا:

اساں نت دے
فی اساں نت دے شرابی رہنانی ہر نام کورے نارے
اوھ وچ کندھ کرلے

مرزا کاظم کرسی سے اچھل پڑے۔ جس پر حاضرین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب نے ان اشعار کو بے حد پسند کیا ہے۔ سردار صاحب پھر بولے :

اسیں مر گئے
فی اسیں مر گئے، کمایاں کر دے فی ہر نام کورے نارے
اے تیرے بند نہ بنے — ہائے فی اسیں مر گئے

اس دفعہ بھی حسب معمول، کافی داد ملی۔ لیکن داد کی حد تو اس وقت ہوئی جب سردار صاحب نے "غالب" کی وہ "مثلث" سنائی جس کی ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا:۔

"موڑیں بابا ڈانگ والیا چھئی"

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور سردار پریتم سنگھ مورخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی، اس کے بعد مرزا کاظم اٹھے اور انھوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا کہ پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے۔ شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو۔ کم از کم برلن میں تو آج تک ایسی تقریر نہ ہوئی ہوگی اور مجھے فخر ہے کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کیے ہیں، میں اس پوری تقریر کا ترجمہ کر کے برلن کے اخبارات میں شایع کراؤں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے مایہ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیا کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی — اس کے بعد صاحب صدر اٹھے اور انھوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ حاضرین کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا، بڑے بڑے ادیب، شاعر، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو لپکے اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازے تک لے جایا گیا۔ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے اسٹیشن تک لے گئے، اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پُر تھیں۔

بقیہ "غالب سے متعلق دو خط"

نکات غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو اور کسی مضمون سے خبر ہی نہیں۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر ایک نظر سرسری ڈالے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گنے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں.....

یہاں مجھے ایک پہیلی کہہ لینے دو۔ میں جغرافیہ طبعی میں اسے لکھ دوں گا کہ آزاد جو اول ہندوستان میں نیچرل پوئٹ ہے اس نے اس کے مضمون کو یوں ادا کیا ہے وہ مضمون یہ ہے کہ خشکی و تری میں ایک رشتہ زن و شوی کا ہے جب تک پانی مٹی سے نہیں ملتا کوئی نبات پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا رشتہ ان میں دختر و مادر کا ہے یعنی خشکی تری کے پیٹ ہی سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی گود میں پلی۔ پہیلی یعنی چیستان ہوتی جائیں کہ وہ دو چیزیں کیا ہیں کہ جو جورو خصم بھی ہیں اور ماں بیٹا بھی ہیں۔

رامپور کا ماحول شعر و سخن

راز یزدانی (مرحوم)

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا سب سے اہم دبستان رامپور ہے۔ اسکی آواز شعر و سخن کی بڑی متوازن آواز ہے۔ رامپور کے ماحول شعر و سخن کا مطالعہ کیے بغیر کوئی اردو شاعری کا مطالعہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ راز یزدانی (مرحوم) نے بڑی کاوش فنی مہارت اور دیانت کیساتھ اسکی داستان بیان کی ہے جو داستان کیساتھ ساتھ تجزیہ بھی ہے۔

زیر ترتیب — نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر عبادت بریلوی

انگلستان کے کتب خانوں میں راقم کو غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط درج ذیل ہے۔ یہ خط مواس سمائی احمد صاحب تعلقہ دار مہیوا پرگنہ مہولی سیتاپور کے نام لکھا گیا ہے، اور اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اس میں ان کا مخصوص انداز بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

"مولانا و بالفضل اولانا! فقیر میں جہاں اور عیب ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حکام سے بہ سبب ریاست خاندانی کے علاقے کے اکثر ملاقات رہتی ہے ـــــ کبھی خوشامد کسی کی نہیں کی بھلا حضرت سے جھوٹ کیوں بولتا، اور آپ کی خوشامد کیوں کرتا۔ ایسا عاصی بھی نہیں واللہ باللہ کو تکیہ کلام جانتا ہوں۔ موحدہ کو اور واؤ کو تسمیہ جان کر از روئے قسم لکھا تھا، اور اب بھی از روئے قسم کہتا ہوں کہ نثر کے اس شیوۂ خاص میں اور مدعیوں سے آپ بہتر ہیں۔ آپ کو اپنا ہم فن اور ہم زبان سمجھ کر اپنا دردِ دل آپ کے سامنے کہا تھا۔ آپ نے غمخواری نہ کی۔ بلکہ اور الٹا آپ مجھ سے ملول ہوئے۔ خیر یہ بھی میرے بخت کی برگشتگی تھی کہ حضرت کے ذہن نے میرے خلافِ مقصود سے جہت انتقال کیا۔ برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنے چھوڑ دیے۔ اب شہزادہ بشیر الدین بہادر نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی میں خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع ـــ بہتّر برس کی عمر، حواس مسلوب، قویٰ مضمحل، بصارت میں ضعف، ہاتھ میں رعشہ، نسیان مستولی ـــ آپ کا خط آیا، پڑھا، جواب اور وقت پر حوالہ کرنے خط مع سرنامہ رکھ چھوڑا ـــــ آج جو جواب لکھنے بیٹھا، خط نہیں ملتا۔ نہ بکس میں نہ کتابوں میں نہ طاق میں۔ حیران کہ اب کیا کروں۔ جو کچھ یاد آگیا اس کا جواب لکھا ـــــ قِران کے بارے میں عرض یہ ہے کہ، زہرہ مشتری کا ایک برج اور درجہ و دقیقہ میں برابر ہونا قِران السعدین ہے۔ اور یہ قرانات جزئیہ میں سے ہے۔ اور اکثر واقع ہوتا ہے۔ اور یہ خبر ـــــ؟ حسب سلطنت موجود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قِران پڑا ہوگا۔ بشرط آں کہ بُرج طالع میں یا اوتاد ثلثہ یا اُمّل اوتاد میں واقع ہو کہ نظر اس کے طالع موعودہ پر ہو۔ تو وہ افادہ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس ـــــ وہ قِرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقالِ سلطنت ہوتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک قِران تھا کہ زحل و مریخ میں فراہم ہوئے تھے۔ سراسر ہندوستان کی خاک اڑا دی ـــــ قصہ مختصر جو بادشاہ صاحبِ قِران کہلاتا ہے بہ اعتبار افراط جاہ و جلال و قوت حال کہلاتا ہے۔ طالع ولادت میں قِران السعدین واقع ہونا ضرور نہیں ـــــ صاحبِ قِران مرادف شاہنشاہ ہے۔ سو بھی صرف سلاطین تیموریہ میں جو شخص صاحب قِران کہلائے ہیں۔ امیر تیمور اور شاہجہاں۔ تتبع کلام اساتذہ سے معلوم ہوگا کہ خاقانی نے اپنے آپ کو صاحب قران لکھا ہے۔ اس طرح فقیر نے بھی لکھا ہے۔ ع

سزد گر نویسند صاحب قرانم

ادمیاں موت توقیع نویسی علت نہیں ہے۔ صاحبِ قراں کہلانے کی۔ فقط

اسد اللہ [مہر]

شنبہ ششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

از روئے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔"

مہیوا پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور ۶ اکتوبر سنہ ۶۶ء - بیرنگ ضروری
جواب طلب۔ بخدمت مخدوم و مکرم مولوی نعمان احمد صاحب ادمجدہٗ
از اسد
مقبول باد

(افکار کراچی)

غالب کا ایک گمنام شاگرد

نادم سیتاپوری

غالب کے فن اور آرٹ کی پرکھ کے ساتھ "غالبیات" کے جن پہلوؤں سے ارباب ادب کی وابستگی بڑھتی جارہی ہے۔ ان میں "تلامذۂ غالب" ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ غالب کی اس معنوی نسل میں کہیں کہیں غالب کے فن اور آرٹ کی اچھی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ جس طرح غالب وسیع الاحباب تھے اسی طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا جو کم وبیش ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے جناب مالک رام نے شیرازہ بندی کرکے "تلامذہ غالب" میں بہت کچھ یکجا کردیا ہے پھر بھی اس تصویر میں کچھ ایسے رنگ باقی رہ گئے ہیں جو ابھی تک ابھر نہیں سکے۔

حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری بھی غالب کے ایسے ہی گمنام اور غیر معروف شاگردوں میں ایک ہیں جن کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں اور شاید ارباب نظر انھیں جدید تحقیق کی اس کسوٹی پر ابھی تک پرکھ نہ سکے جسمیں روایات و درایات کے اصولوں کی دیکھ ریکھ کچھ ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ فکر و تحقیق کی اس "محصور و مقید" فضا میں ظاہر ہے طالب جیسے گمنام عاشق غالب کے بارے میں مستند تحریری ثبوت کو فراہم کرنا صرف دشوار نہیں بلکہ بہت کچھ محال ہی ہے اور تحقیق کی تنگی داماں کا مداوا سوائے ان مقامی روایات کے دوسرا ممکن ہی نہیں ہے جنھیں میں بہرحال قابل اعتماد و مستند سمجھتا ہوں۔

طالب میرے شعور سے پہلے اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ کچھ دور کی قرابت بھی تھی مجھسے! ان کا مکان بھی میرے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا مجھے ان تمام بزرگوں کی خدمت میں بھی حاضری کے مواقع حاصل رہے جنھوں نے طالب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں زیادہ تر نگاہوں سے اوجھل ہوچکے پھر بھی سیتاپور ان کے دیکھنے والوں سے خالی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی نجی اور ذاتی یادداشتوں میں بھی طالب کا ذکر کیا ہے اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ! مثلاً قاضی الیاس حسین جعفری سیتاپوری اپنے خود نوشت حالات "اپنی کہانی اپنی زبانی"[1] (غیر مطبوعہ) میں طالب کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "یوم پنجشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حکیم سید محمد شریف صاحب طالب ساکن سیتاپور محلہ بنگلہ دفعتاً ملک عدم کو روانہ ہوگئے ـــــ یہ طبابت میں اپنے باپ حکیم مفتی سید اولاد علی صاحب (جرح) کے شاگرد تھے اور شاعری میں غالب دہلوی سے تلمذ تھا ان کی طبیعت نہایت تیز و حاضر تھی اور دواؤں کے افعال و خواص انھیں ازبر تھے اور تشخیص بھی اچھی تھی ـــ اردو کی نظم اچھی لکھتے تھے اور جلد ـــ یہ بھی اپنا یہ کمال اپنے ساتھ لے گئے۔"

قاضی الیاس حسین (اکتوبر ۱۸۸۴ء ـــ مئی ۱۹۵۰ء) نہ محض سیتاپور کی زندہ تاریخ تھے بلکہ طالب کے ہم جدی اور بنی اعمام میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب چند پشتوں کے بعد ہی طالب سے ملتا تھا قاضی صاحب نے اپنے خود نوشت حالات (اپنی کہانی اپنی زبانی) پورے تین سو چھ ۳۰۶ صفحات پر تحریر فرمائے ہیں جس میں اپنے خاندانی اور ذاتی حالات ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ تقریباً پچاس ۵۰ سال کے مقامی، موسمی، ملکی اور ادبی کوائف کو بھی یکجا کردیا ہے۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے اور شعر و سخن سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ کاتب تخلص فرماتے تھے۔ لیکن شعری شعور کچھ زیادہ جاندار نہ تھا۔ صحیح معنوں میں مورخ و محقق بھی نہیں تھے لیکن ثقہ اور دیانت دار اتنے تھے کہ ان کی تحریرات پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا! طالب سے جو قرابت قریبہ تھی

---

[1] اصل مخطوطہ قاضی الیاس حسین کے بھائی ماسٹر ایوب حسین جعفری (قصیارہ، سیتاپور) کے پاس محفوظ ہے۔ (نادم)

اس اعتبار سے ان کی معلومات بہرقیمت قابل اعتماد ہیں۔ قاضی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں جس حسرت ناک سانحہ سے دوچار ہوئے وہ آج تک معمہ بنا ہوا ہے۔ ۲۴ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک عزیز کی تعزیت میں "باڑی" ضلع سیتاپور گئے۔ لیکن واپسی کے بعد پھر ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ "باڑی" سے ریلوے اسٹیشن "سدھولی" کی طرف آتے ہوئے اس طرح غائب ہوئے کہ تلاش و تجسس انگشت بدنداں ہے! جانے زمین کھا گئی یا آسمان!۔ غالب سے طالب کا سلسلہ تلمذ اور والہانہ وابستگی کی داستانیں ہمیشہ سیتاپور میں زبان زد خاص و عام رہیں ـــــ اور ان مناظر کو دیکھنے والے تو اب بھی موجود ہیں۔ جب طالب اپنے استاد غالب کا کلام والہانہ طور پر پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ میرے محترم اور معمر بزرگ خان بہادر سید محمد ذکی صاحب رضوی (ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یو۔پی) اپنے ایک نجی خط (مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۲ء) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تم نے جو کچھ سنا ہے وہ ٹھیک ہے! حکیم محمد شریف صاحب مرحوم یقیناً جناب غالب مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنا تخلص طالب کس لحاظ سے رکھا؟ تو مرحوم (طالب) نے فرمایا کہ میرے استاد (غالب) کے تخلص کے ہموزن کوئی اور لفظ اس سے اچھا نہیں ملا۔ وہ ایک بار اپنے استاد مرحوم سے ملنے دہلی گئے تھے۔ اس زمانے میں سیتاپور سے دہلی جانا بہت دشوار تھا۔ دہلی سے واپسی پر جناب قاضی سید محمد صاحب اعلی اللہ مقامہ نے جو اس وقت رجسٹرار تھے ان کو لاہرپور ضلع سیتاپور میں سب رجسٹرار کی جگہ دے دی اور شاید اسی وجہ سے وہ دہلی نہ جا سکے! میں نے مرحوم کی دو غزلیں دیکھی تھیں جن پر غالب مرحوم نے اپنے قلم سے اصلاح دی تھی! اور ان کے ساتھ غالب مرحوم کے خط بھی تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے صاحبزادے "احمد شریف" کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے غالباً محمد شریف صاحب مرحوم (طالب) کے تمام کاغذات تلف ہو گئے!

ایک بار میں اپنی ملازمت کے کام سے دورہ پر حکیم صاحب مرحوم (طالب) سے اُن کے موضع "کورکی" میں ملا تھا۔ آموں کی فصل تھی اور حکیم صاحب ایک آم کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اسی اثنار میں اس درخت سے ایک پختہ آم گرا۔ حکیم صاحب نے اسے پانی سے دھو کر مجھے مرحمت فرمایا۔ اور جناب غالب مرحوم کا وہ قطعہ پڑھا "بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے"!

....

انگبین کے بحکم رب الناس بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس

جب اس شعر پر پہنچے تو فرمایا ـــــ دیکھو "سر بمہر" کی تشبیہ کتنی مناسب ہے اور تم کھا کر دیکھو اس کا رس "انگبیں" ہے یا نہیں"۔

سیتاپور کے معمر ترین بزرگوں میں خان بہادر صاحب بڑی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسّی سال سے کچھ زیادہ ہی عمر ہے۔ ہوش و حواس میں اب بھی کسی قسم کی کمی نہیں۔ آپ کے والد ماجد میر کاظم حسین وفا سیتاپوری طالب کے ہمسن معاصرین میں تھے ـــــ اور خود خان بہادر صاحب نے طالب کی زندگی کے کھلے اوراق کا مطالعہ کیا ہے۔

ہندستان بھر میں "اودھ" غالباً وہ منفرد علاقہ تھا جہاں غالب اپنی زندگی میں بہت ہی کم مقبول ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ "اودھ" میں غالب کے شاگردوں کا حلقہ اتنا محدود تھا کہ جناب مالک رام "تلامذۂ غالب" میں صرف مندرجہ ذیل شاگردوں کا ذکر کر سکے۔

۱۔ شاہ ولایت علی خاں عزیز صفی پوری
۲۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی
۳۔ شیخ لطیف احمد عثمانی کیف بلگرامی
۴۔ مولوی مقصود عالم مقصود بھانوی
۵۔ سید ناصر الدین حیدر خاں ناصر لکھنوی (عرف یوسف مرزا)
۶۔ حکیم محب علی نیر کاکوروی۔

اس فہرست میں اگر حافظ محمد حسین بسمل خیر آبادی (نبیرۂ مولانا فضل حق خیر آبادی) اور حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری کے نام کا اضافہ کر لیا جائے تب بھی یہ تعداد ایک درجن تک نہیں پہنچتی۔ ممکن ہے تلاش و جستجو سے ایک آدھ نام اور بھی مل جائے لیکن اس کے باوجود اودھ میں غالب کی عدم مقبولیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اس وقت کا "اودھ" دراصل آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر۔ اور امیر مینائی وغیرہ سے کافی متاثر تھا۔ دلّی کے مقابلے میں "لکھنؤ اسکول" کی بنیاد پڑ چکی تھی چنانچہ لکھنؤ کی قربت سے سیتاپور کا متاثر ہونا بھی قدرتی بات تھی! یہاں آتش۔ انیس اور دبیر کے ماننے والوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ غالب اور سیتاپور کے مابین ہم آہنگی اور اخلاص کا جو رشتہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے ذریعہ قایم ہوا تھا وہ (غدر سے پہلے) غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عباس بیگ (ابن مرزا اکبر بیگ بدخشی) کے سیتاپور نقل سکونت کر لینے سے کچھ اور مضبوط ہو گیا۔ اور غدر کے بعد تو غالب کے تمام "باقیات الصالحات" بھی سیتاپور ہی چلے آئے۔ ان کے بھانجے مرزا جواد بیگ عرف مرزا مغل اور بڑے بھانجے مرزا عاشور بیگ کی اولاد خداداد بیگ محمود بیگ اور رفیع الدین بیگ وحشتی! اس خاندان کے سیتاپور پہنچتے ہی سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (سب جج) آغا عبدالغنی وکیل دہلوی نواب عبدالسلام خاں رام پوری (سب جج) مرزا اسد بیگ دہلوی۔ حکیم مومن خاں دہلوی کے داماد مولوی عبدالغنی وکیل اور اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی وغیرہ آگے پیچھے نہ جانے کتنے نامور اور باکمال سیتاپور آ گئے ـــــ غالب کے متعلقین میں کچھ تو حیدرآباد چلے گئے! کچھ یو۔ پی کے دوسرے اضلاع میں پھیل گئے ـــــ لیکن اس خاندان کی مرکزی شاخ مستقلاً یہیں کی ہو رہی اور آج بھی موجود ہے! سید محمد احمد خاں تو "نیم سیتاپوری" ہو ہی چکے تھے۔ اپنے آخری ایام زندگی میں (مسٹر) سید محمود بھی یہیں آ گئے۔ سیتاپور سے کچھ ایسا عشق ہوا کہ تمام عمر یہیں رہے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کی لاش علی گڑھ لے جائی گئی!

لیکن ان تعلقات کے باوجود نہ تو غالب کبھی مولانا فضل حق خیر آباد[1] (ضلع سیتاپور) آئے اور نہ اپنے بھانجوں سے ملنے کے لیے کبھی یہاں پہنچے! یہی نہیں بلکہ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی "وجیہہ النساء بیگم" کے نکاح میں بھی شریک نہ ہو سکے جو سیتاپور ہی میں غالب کے نواسے مرزا محمود بیگ کے ساتھ ہوئی تھی۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:-

"سید صاحب ـــ تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خاں بہادر کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے تم کیوں شکر گذار ہوتے ہو۔ جو کچھ نیکی اور نکوئی اس اقبال نشان نے تمہارے ساتھ کی ہے وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے۔ اس کا جوہر طبع از روئے فطرت شریف ہے۔ پروردگار اس کو سلامت رکھے اور مدارج اعلیٰ کو پہنچائے۔ یہ اپنے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی "ماں" کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری طرف بھی عاید ہوتا ہے!

وہ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ "ماموں" میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صرف زر سے جی چرایا ہے۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا ـــ مگر کیا کروں! مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاش کہ جب ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے۔" (صفحہ ۳۱۳۔ ادبی خطوط غالب۔ مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ)

یہ رابطہ و تعلق تو اپنی جگہ تھا۔ اس کے برعکس تصویر کے دوسرے رخ میں خیر آباد (ضلع سیتاپور) کی دو مشہور اور ذہین طوائفوں (زہرہ و مشتری) کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں جو غالب کے مشہور حریف آغا علی شمس لکھنوی کی شاگرد تھیں۔ ان دونوں نے بھی غالب کے خلاف بڑے ہنگامہ خیز مضامین لکھے جو "اودھ اخبار" وغیرہ میں چھپا کرتے تھے۔ ریاض خیر آبادی نے بھی اپنی ابتدائے مشق سخن میں غالب کے دیوان کا "جواب" کہنا شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی ایک غزل میری نظر سے گزری ہے۔ مقطع کا آخری مصرعہ تھا:-

میں ہوں ریاض کچھ اسد دہلوی نہیں

---

[1] اودھ کا قدیم قصبہ سیتاپور سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے یہاں آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے علماء اور مشائخ آسودہ خواب ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ قصبہ اودھ کا "مدینۃ الاولیا" سمجھا جاتا تھا۔ اب تقریباً ویران ہو چکا ہے۔ (خادم)

پس منظر خواہ کچھ بھی ہو! لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی کے پوتے مرزا قاسم علی قزلباش بسلسلہ ملازمت سیتا پور پہنچے تو آغا عبدالغنی وکیل دہلوی کے اشتراک سے انھوں نے غالب ہی کی نسبت اسمی سے "غالب الاخبار" جاری کیا مگر اس کا پہلا شمارہ یکم مارچ ۱۸۶۹ء کو نکلا تو غالب کی وفات کو دس بارہ دن گذر چکے تھے!

طالب اسی سیتا پور (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ سن ولادت کا صحیح پتہ تو چل نہیں سکا البتہ قدیم خاندانی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان زمن غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے آخری عہد حکومت (۱۸۱۴ء — ۱۸۲۷ء) میں بمقام سیتا پور پیدا ہوئے اور ۲۷ دسمبر ۱۹۱۸ء میں کم و بیش سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ "تکیہ مدار شاہ" محلہ قضیارہ (سیتا پور) میں سپرد خاک کیے گئے! ان کے والد مفتی سید اولاد علی جریح اپنے دور کے ایک باکمال شاعر گذرے ہیں۔ تمام عمر مداحی اہلبیت اطہار میں بسر کی۔ ان کے فارسی قصائد کا ایک نامکمل قلمی مجموعہ میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

نسبی حیثیت سے طالب سیتا پور کے ممتاز جعفری[۳۲] نیشاپوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلہ نسب بتیس[۳۲] واسطوں سے صادق آل عبا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مورث اعلیٰ حضرت سید شاہ اسمٰعیل نیشاپور سے ترک سکونت کر کے ہندستان تشریف لائے تھے۔ اور قصبہ کہرام (مضافات انبالہ) میں سکونت گزین ہوئے تھے۔ ان کے پوتے سید عبدالملک کہرامی کہرام سے جونپور اور پھر مخدوم سید عادل الملک بہ عہد سلطان ابراہیم شرقی جون پور کو خیرباد کہہ کر رائے بریلی چلے آئے۔ ابوالفتح سید فتح اللہ (عرف شیخ فتن) انھیں بزرگ کی نسل سے تھے۔ جو عہد شاہجہانی میں سیتا پور آ بسے تھے جن کی یادگار سیتا پور میں ایک محلہ "فتن سرائے" آج بھی موجود ہے۔

نیشاپوری سادات میں بڑے بڑے صاحبان شریعت و طریقت بزرگ گذرے ہیں۔ مخدوم عادل الملک کا مزار آج بھی رائے بریلی میں مرجع خاص و عام ہے۔ مخدوم عادل الملک کی چھٹی پشت میں سید ظہیر الدین کہرامی مصنف "فتاوائے ظہیری" کا شمار ان ارباب علم و فضل میں ہے جن کے اذکار سے اسلامی تاریخ کے صفحات معمور ہیں۔ میر گلزار حسین ارم، مولوی نیاز احمد نامی سیتا پوری اور ہند و پاک کے مشہور ادیب و صحافی سید رئیس احمد جعفری ندوی تو اسی صدی کے اہل کمال ہیں جنھیں شاید بہت دنوں تک دنیا نہ بھلا سکے گی۔

طالب کے والد مفتی سید اولاد علی جریح کا انتقال غدر ۱۸۵۷ء سے آٹھ نو سال قبل (تخمیناً ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء) میں سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے ابتدائی عہد حکومت میں ہوا۔ ان کے قبضہ میں سیتا پور کے قریب ہی کئی مواضعات کے حقوق متاجری تھے۔ تمول۔ فراغ البالی اور امارت کے چوچلوں نے جریح کے مرتے ہی اچانک حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ "بوہرے" مہاجن کا آٹھ دس ہزار قرض ہوا اور طالب حالات سے کچھ ایسے گھبرا گئے کہ بلا کہے سنے سیتا پور کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے۔ طبابت اس خاندان کا موروثی پیشہ تھا۔ طالب نے فن طب کی تکمیل اپنے باپ سے کی تھی اور وہ بھی اس طلب و ذوق کے ساتھ کہ ابتدا ہی سے ان کا شمار حاذق اطبا میں ہونے لگا تھا۔ خدا نے دست شفا ایسا دیا تھا کہ کوئی مریض ان کے مطب سے ناکام و مایوس نہیں جاتا تھا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی انھیں خوش قسمتی سے شاہی خاندان کے ایک بیمار کے علاج کا موقع مل گیا۔ مریض شفایاب ہوا اسی کے ساتھ ہی ان کی شہرت کی دھوم لکھنؤ بھر میں مچ گئی۔ نواب سلیمان قدر بہادر نے قدر افزائی فرمائی اور یہ ان کی سرکار میں بزمرۂ طبیب خاص ملازم ہو گئے۔

نواب سلیمان قدر بہادر آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے مختلف البطن بھائی تھے ان کی سرکار میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ناسخ کی اس غزل کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی جس کا مطلع ہے۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا — طلوع صبح محشر۔ چاک ہے میرے گریباں کا

لکھنؤ بھر میں اسی طرح پر مشاعرے ہو رہے تھے۔ نواب سلیمان قدر بہادر کے یہاں بھی اسی طرح میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لکھنؤ کے تمام اساتذہ فن موجود تھے۔ لیکن طالب نے جب اپنی غزل پڑھی تو ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ اس غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

---

[۱] صفحہ ۸۵۴ بغایتہ ۸۶۵ "شجرات طیبات" مطبوعہ امیر المطابع سیتا پور ۱۹۱۸ء۔

فروزاں ہے جو دلمیں داغ عشق شعلہ رویاں کا — گماں ہوتا ہے دود آہ پر دود چراغاں کا
یہی ہے زور گر دست جنون فتنہ ساماں کا — نگہباں ہے خدا ہی صبح محشر کے گریباں کا
فروغ شعلۂ حسن رخ پر نور کے آگے — تجلی اک چراغ مردہ ہے گور غریباں کا
دہن سے ہر نفس کے ساتھ اک شعلہ نکلتا ہے — فضائے سینہ جو لالہ کہ ہے کس برق تاباں کا
لگی ہے جس کی لو تجھسے اسے کیا خوف صرصر ہو — چراغ لالہ کو فانوس ہے دامن بیاباں کا

اس غزل کے دوسرے مطلع نے لکھنؤ بھر میں دھوم مچادی۔ بڑے بڑے اہل کمال اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ طالب کا مطلع ثانی ناسخ کے مشہور مطلع سے بہت آگے بڑھ گیا۔

اسی مشاعرے کا ایک دلچسپ لطیفہ اور بھی مشہور ہے کہ کسی مسخرے نے ناسخ کی پوری غزل کو الٹ پلٹ کر مشاعرے میں پڑھ دیا۔ مثلاً مطلع کے پہلے مصرعہ میں "مشرق" کے بجائے "مغرب" بدل کر اس طرح پڑھا:-

مرا سینہ ہے "مغرب" آفتاب داغ ہجراں کا

لوگوں نے کہا یہ تو استاد ناسخ ہی کے مطلع کو آپ نے الٹ دیا۔ مسخرے شاعر نے جواب دیا۔

"حضور ــــ گستاخی معاف! آپ کو مشرق و مغرب میں بھی فرق نظر نہیں آتا ــــ استاد نے مشرق کی بات کہی ہے اور میں "مغرب" کا ذکر کر رہا ہوں"۔

طالب نے ابتدائے مشق سخن اپنے والد مفتی اولاد علی جریح سے کی۔ اور زیادہ تر فارسی ہی میں کہتے تھے۔ شریف تخلص فرماتے تھے چنانچہ ان کی بہت سی اردو غزلیں بھی ایسی ہیں جن میں انھوں نے "شریف" تخلص نظم کیا تھا۔ لیکن جب غالب کے شاگرد ہوئے اور استاد کا ہم قافیہ تخلص "طالب" اختیار کیا تو اپنے قلم سے شریف تخلص قلمزد کر کے "طالب" بدل دیا!

نواب سلیمان قدر بہادر کی سرکار سے طالب کب تک وابستہ رہے! اس مدت کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۰ء تک وہ "لاہر پور"[1] میں عہدۂ سب رجسٹراری پر ضرور فائز ہو چکے تھے۔ اس زمانے تک "محکمۂ رجسٹری" میں تمام ملازمین کی تقرری اور برخواستگی "قاضی ایکٹ" مطابق ڈسٹرکٹ رجسٹرار کے ہاتھ میں رہتی تھی اور سیتا پور میں ڈسٹرکٹ رجسٹرار طالب کے سمدھی "قاضی سید محمد" ہی تھے انھیں کے توسل سے یہ لاہر پور کے سب رجسٹرار مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اسی عہدے پر فائز رہے!

سب رجسٹراری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے لیے انھوں نے پنشن نہیں لی بلکہ اسی جگہ پر اپنے اکلوتے صاحبزادے مفتی سید احمد شریف گہر کو سب رجسٹرار مقرر کرا دیا جو مدت العمر سب رجسٹرار رہے اور یہیں سے پنشن پائی۔

طالب اپنے آخری ایام زندگی میں زیادہ تر اپنے گاؤں کرکی میں رہا کرتے تھے جو ان کی زمینداری میں سیتا پور سے قریب ہی چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اپنے ایک موروثی گاؤں سے انھیں بے حد محبت تھی جب بھی سیتا پور میں رہتے رہتے گھبرا جاتے پالکی پر سوار ہو کر یہیں چلے جاتے جہاں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ان کی مختصر سی دیہاتی قیام گاہ بنی ہوئی تھی جسے "اودھ" کی زمیندارانہ اصطلاح میں "کوٹھار" کہتے ہیں۔

غالب سے رشتہ تلمذ قائم ہونے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں البتہ سیتا پور کے معمر ترین بزرگ حکیم سید احمد[2] احمد سیتا پوری (۱۸۵۰ء

---

[1] "لاہر پور" ضلع سیتا پور کا ایک پرانا قصبہ ہے جسے اکبر اعظم کے مشہور نورتن۔ عین السلطنت راجہ ٹوڈرمل کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے راجہ ٹوڈرمل کے بنوائے ہوئے "راجہ تال" کے کھنڈرات اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ سیتا پور سے بیس بائیس میل پر واقع ہے۔

[2] حکیم سید احمد۔ احمد سیتا پوری "معیار پارٹی" (لکھنؤ) کے ایک خاص رکن تھے مرحوم ماہنامہ "معیار" لکھنؤ میں ان کا کلام برابر چھپتا تھا۔ میرے والد کے خاص ملنے والوں میں تھے اور میرے ساتھ ہمیشہ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کے والد مولوی نعمان احمد کا شمار عمائدین سیتا پور میں تھا فارسی کے ا

(باقی صفحہ آئندہ)

(اکتوبر ۱۹۶۲ء) بیان فرماتے تھے کہ ــــــ

"مفتی صاحب (طالب) میرے والد مرحوم مولوی نعمان احمد (تعلقدار مہیوہ ضلع سیتاپور) کے گہرے دوستوں میں تھے ہر مہینے ایک کا دوسرے سے ملنا اتنا ضروری تھا جیسے مشرق سے آفتاب کا نکلنا! مفتی صاحب چونکہ فارسی کے ایک مشاق اور نکتہ سنج شاعر تھے۔ اس لیے انھیں غالب کے کلام سے والہانہ وابستگی پیدا ہوگئی۔ خود میرے والد (مولوی نعمان احمد) فارسی کے ایک باکمال انشا پرداز تھے اور کسی حد تک غالب کی فارسی نثر نگاری کے قایل بھی تھے لیکن غالب کے شعری فن سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی وہ لکھنؤ کے رنگ کو زیادہ پسند فرماتے تھے چنانچہ اسی بات پر ان دونوں دوستوں (طالب اور نعمان احمد) کے درمیان اکثر چوٹیں چلا کرتی تھیں ــــ اور والد مرحوم اکثر مفتی صاحب سے طنزاً کہا کرتے تھے کہ جب آپ کو غالب کا رنگ اتنا پسند ہے تو آپ ان کی شاگردی کیوں نہیں کر لیتے ــــ! انھیں باتوں کا نتیجہ نکلا کہ مفتی صاحب بہ نفس نفیس دلی تشریف لے گئے اور غالب کے دست فن پر بیعت کر لی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان سلسلہ مراسلت بھی قایم تھا میں نے بھی دو ایک خطوط دیکھے ہیں"

طالب کو اپنے استاد (غالب) سے جو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ وہ غالب کا فارسی اور اردو کلام پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سیتاپور کی فضا غالب کے لیے سازگار نہیں تھی چنانچہ اس دور کے بعض شوخ و طرار نوجوان طالب کے اس جذبہ عقیدت کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ کب وہ نماز شروع کریں ــــ اور یہ لوگ انھیں ستانے پہنچ جائیں ادھر وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے پہلی رکعت شروع کی کہ دو چار لڑکے پہنچ گئے ــــ ایک نے غالب کا شعر پڑھا۔

درد منّت کش "دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دوسرے نے شعر کی تعریف شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ اس شعر کی شرح بھی ــــ! "منت کش" ایران میں ایک بہت بڑا دواخانہ تھا ..... اور ..... اور ..... "

طالب پہلے تو لڑکوں کو مخاطب کرنے کے لیے زور زور سے نماز پڑھنے لگتے اور جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوتی تو نماز توڑ کر ان کے پیچھے دوڑتے ــــ!

مگر یہ کہاں ماننے والے۔ دوبارہ نماز شروع کی! پھر شیطان بن کر موجود! اب غالب کے اس مقطعے کی شرح بیان کی جا رہی تھی ــــ

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ "سر یاد" آیا

ایک نے مقطع پڑھا ــــ دوسرے نے شرح بیان کرنا شروع کر دی:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انشا پرداز تھے۔ میر غلام حسین قدر بلگرامی کے اصرار پر انھوں نے غالب کو فارسی میں خط لکھا۔ لیکن غالب نے اس کا جواب اردو میں دیا کیونکہ غدر ۵۷ء کے بعد وہ عام طور سے اردو ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کو غالب کی یہ ادا پسند نہیں آئی چنانچہ یہ سلسلہ مراسلت زیادہ دنوں تک قایم نہ رہ سکا۔ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی نے غالب کے یہ چاروں خطوط ماہنامہ آجکل دہلی میں شایع کر دیئے ہیں جو انھوں نے مولوی نعمان احمد کو لکھے تھے۔ غالب کے آخری خط میں جواب نہ دینے کا شکوہ بھی ہے۔

حکیم سید احمد نے دفعتاً، ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بارہ برس کی تھی مگر ہوش و حواس اتنے اچھے تھے کہ استقبال سے چند ماہ پیشتر جب میں ملنے گیا تو تقریباً دو تین گھنٹے تک برابر باتیں کرتے رہے۔ قدیم سیتاپور کے ادبی اذکار، اپنے انگلستان کے سفر کی روداد اور خود اپنے خاندانی حالات! شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر کچھ نہ کچھ بات چیت نہ ہوئی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حالات مجھے لکھوا دیجئے۔ فرمایا جب جی چاہے دو چار دن ٹھہر کر قلم بند کر لو ــــ لیکن یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی ایک دن معلوم ہوا کہ ان کی لاش لکھنؤ سے سیتاپور آئی ہے اور عید گاہ کے قبرستان میں قبر کھودی جا رہی ہے۔ (نادم)

"صاف سا مقطع ہے غالب نے اپنے لڑکپن میں کہا تھا اور خوب کہا تھا یعنی جب انھوں نے مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تو اچانک مجنوں کا باپ" سر یاد آگیا ....."

غرض کہ اسی طرح طالب مرحوم کو بار بار نماز توڑنا پڑتی اور یہ ناشعور لڑکے انھیں ستایا کرتے۔

ہونے کو طالب کے دس بارہ اولادیں ہوئیں مگر سوائے ایک صاحبزادے مفتی سید احمد شریف اور ایک صاحبزادی کے تمام اولادیں کم عمری ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ صاحبزادی میرے رشتہ کے چچا سید حیدر حسین حیدری سے منسوب تھیں جن کے بطن سے صرف ایک دختر "معظم النسا بیگم" ہوئیں جو بقید حیات ہیں۔

مفتی سید احمد شریف بڑے ہی محرور المزاج مگر متقی بزرگ تھے تخمیناً ۱۹۲۵ء تک یو۔پی کے مختلف اضلاع میں سب رجسٹرار رہے۔ جون ۱۹۳۱ء میں بمقام سیتا پور وفات پائی۔ شعر و سخن سے بھی کچھ دلچسپی تھی "گہر" تخلص فرماتے تھے۔ کلام میں سلاست اور روانی تھی روزمرہ اچھا کہتے تھے۔ ایک غزل سنائی تھی جس کے صرف دو شعر اس وقت یاد ہیں:۔

اب دلوں میں باہمی الفت نہ یاری رہ گئی — تُو تُو۔ مَیں مَیں۔ آئے دن میری تمہاری رہ گئی
تم شبِ وعدہ نہ آئے۔ اپنا عالم کیا کہیں — جس طرح گذری گذاری۔ ضد تمہاری رہ گئی

طالب کے نامکمل دیوان میں جو غزلیں ہیں انھیں دو حصّوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو ابتدائی دور جب وہ شریف تخلص کرتے تھے۔ دوسرا دور غالب سے افتخار تلمذ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کا جو نامکمل قلمی دیوان ہے اس میں فارسی کا ایک قصیدہ اور ایک حمد بھی ہے۔ یہ وجد آفریں حمد اگرچہ نامکمل ہے لیکن اسے پڑھ کر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں فارسی کے ادب عالیہ پر اچھا خاصا عبور تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے انھیں غالب کے پرستاروں میں شامل کر دیا تھا۔ حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را — کہ در کُنہہ اُو حسرت ادراک را
دو رنگ آفرینندۂ روز و شب — ثریا عطا ساز تاک عنب
فرازندۂ کاخ گرداں سپہر — فرودزندہ گوہر ماہ و مہر
دہد نطق و ہم فہم و سمع و بصر — کنی تا کہ ادراک نفع و ضرر
سفید و سیاہ و بہ نقش و کبود — بسے رنگ ہائے گزین و انمود
عطا میکند انچہ می شایدت — کہ ہر یک بہ ہر لحظہ کار آیدت
معین مددگار ہر مستمند — رہا نندہ عاجزاں از گزند
ادا کے شود شکر احسان اُو — خوش آن کہ پوید بہ فرمان اُو

طالب کا جو اردو کلام اب تک میں فراہم کر سکا ہوں اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی شاعری میں جو موڑ پیدا ہوا وہ غالب کے فیض تلمذ کا رہین منت ہے البتہ ایک مقطع سے اس حقیقت پر ایک ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے۔

بہت جانکاہیوں سے کوششیں کیں طرز غالب میں — ہوا ممکن نہ اے طالب وہ انداز بیاں پھر بھی

طالب اپنے استاد میں کتنا محو و مستغرق تھے اس کا اندازہ ان کی اسی غزل کے ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے؟

تمہاری دوستی ہی میری بربادی کو کافی ہے — ضرورت کیا ہے جو دشمن بنے یہ آسماں پھر بھی

اسے نہ تو غالب کا سرقہ کہا جا سکتا ہے نہ توارد ــــ میں تو اسے "استغراق عقیدت" ہی سمجھتا ہوں۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ غالب کا یہ شعر انھوں نے نہ پڑھا ہو ــــ

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے! — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

نمونہ کلام کے طور پر میں بلا کسی تبصرے کے طالب کی انھیں غزلوں کا سرسری انتخاب پیش کر رہا ہوں جو کسی حد تک غالب کے رنگ میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ اشعار بھی شامل ہوں جن پر غالب نے اصلاح دی تھی۔

ثابت قدمی کر دل شیدا ابھی کچھ اور — واں ہیں ستم حوصلہ فرسا ابھی کچھ اور

کردیوں نے بند کیے آسماں کے در — آہنگ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

بسمل بخون طپیدہ کہ رنگ پریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں
موج صبا پہ بوئے گل نو دمیدہ ہوں — اک آہ سرد و نالہ درد آرمیدہ ہوں
بے تابی اپنی طالب دل خستہ کیا کہوں — نالہ سے رعد آہ سے برق طپیدہ ہوں

تیرے دیوانے کو ہے صحرا کا یوں امن عزیز — جس طرح یعقوب کو یوسف کا پیراہن عزیز
پاکدامانی پہ گو معصوم کی شاہد ہوا — لیکن اپنے دل میں یوسف سے رہا بدظن عزیز
یوں رقیب روسیہ سے اور ہم سے ربط ہے — خار کو رکھتا ہے جیسے دامن گلشن عزیز

کبھی دل آپ کو رسوا نہ کرتا — مگر! مجبور مرتا کیا نہ کرتا؟
جو بھولے سے بھی ہوتی پرسش حال — دل شوریدہ گھبرایا نہ کرتا
وفائے قیس میں ترک ادب تھا — جو تعظیم سگِ لیلا نہ کرتا

پہلے حیات خضر مہیا کرے کوئی — پھر انتظار وعدۂ فردا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت شمع تجلی کا دے فروغ — شوقِ دل کلیم تو پیدا کرے کوئی

طالبؔ وہ جسکے عیب کو چاہے صفت کرے — داغ سفید کو ید بیضا بنا دیا

جامہ کیسا نہ رہا رشتہ جاں بھی تن میں — رہگیا دست جنوں سر بگریباں ہو کر
نابلد ہوں میں رہ دشت جنوں سے بالکل — لے چل اے وحشت دل خضر بیاباں ہو کر

ظاہر ہے دل کا حال مرے، کچھ چھپا ہے کیا — بسمل تری ادا نے کیا پوچھتا ہے کیا
واعظ سنا رہا ہے جو دوزخ کی گرمیاں — کچھ اس میں خوئے یار سے گرمی سوا ہے کیا؟
بلبل بوقت خندۂ گل نالہ کش نہ ہو — اتنا تو دیکھ لے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

عرض نیاز ہی سبب ناز ہو گیا — میں اپنے حق میں آپ دراندازہو گیا

ہر چند درد دل میں چھپاتا رہا مگر — رنگ پریدہ پردہ دار راز ہو گیا

درہم داغِ فراق اس بت سیمیں تن کے — نہیں قارون کے خزانے سے بدلنے والے
بار و رگرنہ ہوا نخلِ تمنا نہ سہی — کیا شجر ہوتے ہیں سب پھولنے پھلنے والے
سخت ہو کیسی ہی منزل مگر آگے پیچھے — بیٹھتے اٹھتے پہنچ جاتے ہیں چلنے والے

جس بات کا نہ تھا کبھی وہم و گماں مجھے — قسمت دکھا رہی ہے وہ نیرنگیاں مجھے
سمجھا جو میری موت میں وقفہ ہے یاں مجھے — کچھ اور جھیلنا ہیں ابھی سختیاں مجھے
کھلتا نہیں کہ قافلے والے کدھر گئے — بھٹکا رہی ہے گرد رہ کارواں مجھے

نالہ ہے بانگ جرس جب کوئی تاثیر نہیں — خواب محمل ہے وہ جس خواب کی تعبیر نہیں
تیرا دھر رُخ تو کریں دیدۂ دل حاضر ہے — ان کی دل کاریوں سے ہم کبھی دلگیر نہیں
دیکھنا جوششِ سودا - یہ ادب کا ہے مقام — حلقہ زلف ہے! دیوانے کی زنجیر نہیں

دل محو مجال دوست مدفون ہے جہاں واعظ — اندھیرے کا بھلا مذکور ہی کیا ان مزاروں میں
توقع ان کے آنے کی عبث رکھتا ہے اے طالب — وہ کیوں آنے لگے ویرانہ بے اعتباروں میں

نازاں ید بیضا پہ نہ ہوتے کبھی موسیٰ — گرد یکھتے جلوہ وہ تری دُرد حنا کا
کچھ کم نہیں شاہی سے ترے در کی گدائی — سایہ تری دیوار کا سایہ ہے ہما کا

ساقی کی بزم تک جو رسائی ہوئی کبھی — قسمت سے میری جام بکو سا رہی رہا
دیکھا ہمیشہ طالب شوریدہ حال کو — رسوا میاں کوچہ و بازار ہی رہا

دل مراد [1] خورجور حسیناں ہی رہا — عمر بھر مثل جرس سرگرم افغاں ہی رہا
التفات غیر سے ہے مدعا ایذا مری — ورنہ وہ نا آشنا سب سے گریزاں ہی رہا
وہ نظارہ سوز ہے یارب جمال روئے یار — دیدۂ حسرت کش دیدار حیراں ہی رہا
طالب آئے بھی گئے بھی لوگ انکی بزم سے — اور تو وقف کشاکشہائے درباں ہی رہا

یہ فیض ہے کسی متلون مزاج کا — ورنہ ہمیشہ رنگ بدلتا زمانہ کیا؟
طالب جو درد دل کا مزا جانتے نہیں — سمجھیں وہ صنعت غزل عاشقانہ کیا؟

(باقی صفحہ ۷ پر)

---

[1] لفظ پڑھا نہ جا سکا

دیوان کامل وشاداں

رشید حسن خاں

نوّاب زین العابدین خاں عارف، غالب کی بیوی امراؤ بیگم، کے حقیقی بھانجے تھے۔ غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں، بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم۔ بنیادی بیگم بڑی تھیں، ان کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی تھی، جن سے دو صاحبزادے ہوئے، زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔ زین العابدین خاں عارف، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے، اُن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اُس وقت ان کی عمر ۳۶ برس کی تھی۔ بقول مالک رام صاحب، عارف کی موت پر غالب نے وہ دردناک نوحہ لکھا تھا، جو اردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کیے۔ دوسری بیوی (بستی بیگم عرف نواب دلہن، دختر میرزا محمد علی بیگ بخارائی) سے دو لڑکے ہوئے، باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کے انتقال سے چند ماہ پہلے، اُن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ عارف کے انتقال کے وقت، باقر علی خاں ۵ سال کے تھے اور حسین علی خاں دو سال کے۔ غالب نے ان دونوں بچوں کو متبنّیٰ کر لیا۔ عارف کی رحلت کے بعد حسین علی خاں کو غالب اپنے یہاں لے آئے۔ باقر علی خاں کچھ عرصے تک اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے، پھر وہ بھی غالب کے پاس چلے آئے۔

دونوں بھائی شاعر تھے اور دونوں اردو فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باقر علی خاں کا اردو میں کامل تخلص تھا فارسی میں باقر۔ یہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ (مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب)

مالک رام صاحب نے بھی ان کو شاگرد سالک لکھا ہے اور تلمذ غالب سے انکار کیا ہے۔ البتہ صاحب سخن شعرا نے ان کو تلمیذ غالب لکھا ہے۔ ۲۵ مئی ۱۸۷۶ء کو یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ) انتیسویں برس میں انتقال کیا (مکاتیب) سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی، اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ چھوٹے بھائی حسین علیخاں شاداں کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ وفات، لوح مزار پر کندہ ہے۔

چو زین غم خانۂ دنیا سفر کرد — سوے باغ جنان باقر علی خاں
بسال رحلتش تحریر گردید — بود مینو مکان باقر علی خاں (ذکر غالب)
۱۲۹۳

سالک نے بھی قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔

"قطعۂ تاریخ وفات مرزا باقر علیخاں کامل خلف زین العابدین خاں عارف۔ فرزند نسبتی نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں۔

یادگار عارفِ مرحوم تھا — کس کو مارا تو نے دوراں حیف ہے!
کیوں دکھایا تو نے اس کو روز بد — جس سے روشن بھی شبستاں حیف ہے!
اُس کے دلبستوں کے دل میں رہ گئے — دیکھو کیسے کیسے ارماں، حیف ہے!
حسن اُس کا، ماہِ کامل سے دو چند — چھپ گیا وہ مہرِ رخشاں حیف ہے!
یہ ہے نوحہ، ہے یہی تاریخ سن — نوجواں باقر علی خاں، حیف ہے!" (کلیات سالک ص ۲۹۳)
۱۲۹۳

ان کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ایک غزل اور ایک مسدس شہر آشوب، قفانِ دہلی، میں محفوظ ہے، اور دو شعر، سخن شعرا میں باقی کلام خدا جانے کیا ہوا!

عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خاں کا تخلص شاداں تھا۔ فارسی میں خیالی تخلص کرتے تھے۔ قفان دہلی، میں ان کا تخلص راقم لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے راقم تخلص تھا، بعد کو شاداں اختیار کیا۔ دربار رام پور سے متعلق تھے امراؤ بیگم کے ایک مکتوب بنام نواب کلب علی خاں مورخہ ۲ اگست ۱۸۶۹ء (مشمولۂ مکاتیب) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاداں اُس وقت دربار رام پور کے متوسلین میں شامل ہو چکے تھے۔ پچیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ تھا (مکاتیب) صاحب خمخانۂ جاوید نے

لکھا ہے کہ "پہلے تیس روپے ماہوار ملتے تھے پھر ساٹھ روپے ملنے لگے۔" مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب، میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا ہے۔ آخر میں دہلی چلے آئے تھے۔ اس آخری زمانے میں دماغی توازن بگڑ گیا تھا جسکی وجہ بقول مالک رام صاحب، بڑے بھائی کی موت کا صدمہ تھا۔ صاحب خمخانہ جاوید نے، اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"آخر زمانے میں ان کو مالیخولیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے یہ خیال اُن کے ذہن نشین تھا کہ شاعر کے لیے دبلا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مرزا ارشد گورگانی، جو اُن کے جگری دوست تھے، ان سے مرزا شاداں کہا کرتے تھے کہ داغ کو کبھی شعر کہنا نہ آئے گا، کیونکہ شاعری اور فربہی سے بہت بعد ہے۔ ہوتے ہوتے یہ جنون یہاں تک بڑھا کہ پانی پینا بھی بہت کم کر دیا۔ ایک چھوٹی سی سیپ کی ڈبیا میں، احتیاط کی وجہ سے پانی پیا کرتے تھے۔ حکیم غلام رضا خاں مرحوم نے ان کو ایک خمیرے کا نسخہ لکھ دیا تھا۔ اب غذا بھی بالکل ترک ہو گئی۔ یہ معمول کر لیا کہ دس بارہ آنے کے پیسے جیب میں ڈالکر، بازار میں آکر کھڑے ہو گئے، اور دو دو چار چار پیسوں کا خمیرہ لے کر کھانا شروع کیا جب سب پیسے ختم ہو گئے، مکان پر آکر لیٹ رہے۔ اب نقاہت اس درجہ بڑھی جس نے جان لے کر ہی چھوڑا۔"

شاداں کا انتقال، نیجم شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۸۰ء) کو ہوا۔ انتقال کے وقت ۳۰ سال کی عمر تھی۔ سناخ نے تاریخ کہی:

برفت آہ شاداں ز دنیائے دوں — خدایا مقامش بفردوس باد
برائے سند رحلتش خامہ ام — رقم کرد "شادانِ فرخ نہاد"

خم خانہ جاوید، میں لکھا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۷ برس کی تھی، یہ صحیح نہیں۔ نیز صاحب خمخانہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ "فغان دہلی کی تحریر کے وقت ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی ہو گی۔" بقول مالک رام صاحب اس وقت ان کی عمر "۹-۱۰ برس سے زیادہ نہیں تھی" (تلامذہ غالب)

کتاب خانہ رام پور میں کلام شاداں کا ایک مختصر سا قلمی نسخہ ہے، جو ۱۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں کل ۲۸۲ شعر ہیں۔ سفید باریک کاغذ ہے۔ کتابت واضح ہے۔ سرورق پر ناظم کتاب خانہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی یہ تحریر ہے۔

"این نسخہ را کمترین امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ، از ردی خانہ یافتہ است و گمان غالب میدارد کہ اصل نسخۂ شاداں مرحوم است مرقومہ ۸ مئی ۱۹۳۸ء"

اس کے کاتب نے ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے جس غزل کو جہاں چاہا لکھ دیا ہے۔ خم خانۂ جاوید، میں شاداں کا کافی کلام درج کیا گیا ہے۔ صاحب خمخانہ نے لکھا ہے: "مجموعہ کلام ان کے اعزہ احباب کی غفلت سے تلف ہو گیا۔ اکمل الاخبار، ان ایام میں جاری تھا، اس کے پرانے فائلوں اور بعض دہلی کے مشاعروں کی غزلیں بے حد کاوش و جستجو سے ملیں، وہ درج ذیل ہیں۔" — اس میں ۱۴۲ بطور انتخاب کلام ہیں اور دو شعر حالات میں درج ہیں۔ اس طرح کل ۱۴۴ شعر ہیں۔ ان میں سے ۵۵ شعر دیوان میں موجود ہیں — اور ایک شعر فغان دہلی، میں ہے۔ تذکرۂ انتخاب یادگار، میں اردو کے ۵ شعر ہیں، یہ پانچوں مخطوطۂ دیوان میں موجود ہیں۔ سخن شعرا، میں تین شعر ہیں، یہ خمخانہ میں درج ہیں۔ تذکرۂ طور کلیم، میں سات شعر ہیں، ان میں سے تین مخطوطے میں ہیں اور چار خمخانہ میں، تلامذہ غالب، میں جو شعر ہیں وہ خمخانہ سے ماخوذ ہیں۔ غرض شاداں کا جو کچھ کلام ہے، وہ دو جگہ ملتا ہے۔ اس مذکورہ مخطوطے میں یا خمخانہ جاوید میں۔

انتخاب یادگار میں، فارسی کے پانچ شعر درج ہیں۔ دو شعر ایک قصیدے کے، ایک دوسرے قصیدے کا، اور دو شعر دو مختلف غزلوں کے ہیں۔ ان کے سوا فارسی کلام اور کہیں نہیں ملتا ہے۔ تذکروں کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا مثلاً امیر مینائی نے انتخاب یادگار، میں لکھا ہے کہ: "وطن انکا دہلی ہے۔ مگر اب یہیں رہتے ہیں۔ پچیس برس کا سن ہے، شاعری کا مشغلہ رات دن ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ شوق کا حال یہ ہے کہ کسی وقت فکر سے خالی نہیں رہتے ہیں۔ طبیعت دقت پسند ہے، فکر بلند ہے۔" — احمد علی خاں شوق نے تذکرۂ کاملان رامپور، میں لکھا ہے کہ:

"رامپور میں بوجہ ملازمت قیام رہا۔ بہت سے شاگرد تھے۔ شاعری کا رات دن مشغلہ تھا۔"

جو شعر خم خانہ جاوید سے ماخوذ ہیں اور مخطوطے میں نہیں ہیں، ان کے سامنے (خ) لکھ دیا ہے یا حاشیے پر نوٹ دے دیا ہے۔ یہ اسلیے ہے کہ مخطوطے کے اشعار اور مطبوعہ اشعار میں امتیاز ہو سکے۔ ایک شعر فغان دہلی سے ماخوذ ہے۔ اس کے آگے (ف) لکھ دیا ہے۔ فارسی کے پانچوں شعر، انتخاب یادگار سے ماخوذ ہیں۔

باقر علیخاں کامل کا کلام تو اتنا بھی نہیں ملتا۔ نا چار فغان دہلی کی ایک غزل، اور ایک مسدس شہر آشوب، اور سخن شعرا، میں درج، دو اشعار پر قناعت کرنی پڑی۔ ان کو بھی آخر میں شامل کر دیا ہے — کامل اور شاداں کے مفصل حالات کے لیے مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب، اور ذکر غالب، مرتبہ مالک رام صاحب دیکھیے، اس مختصر سی تحریر میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بیشتر انھیں سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان دونوں کتابوں میں خصوصاً مکاتیب غالب، میں ساری ضروری تفصیلات درج ہیں، اس لیے ان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جو لوگ کامل و شاداں کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنا چاہیں، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصیدہ در مدحِ جناب نوّاب محمد کلب علیخاں صاحب بہادر، دام اقبالہٗ

سبز و شاداب چمن میں ہیں امیدوں کے نہال
تجھ سے ہے کلب علی خاں چمنِ دہر نہال

سعدِ اکبر کو ملا تیری قلمرو میں شرف
نظر آتے نہیں شادی کے سوا رنج و ملال

تو وہ ہے جو کہ بس اک دم میں لٹا دے سب کو
تیری نظروں میں ہے قارون کا خزانہ کیا مال

تیرے ہی لطف سے رہتی ہے رعایا خرسند
ورنہ چلتا ہے فلک تو وہی اک ظلم کی چال

فی المثل وہ ہے اگر ذرّہ تو، تو ہے خورشید
عدلِ کسریٰ کو ترے عدل سے کیا دیجے مثال

بس کہ مشہور ہوئی داد پژوہی تیری
اب کوئی ظلم کسی پر کرے، کیا یارے مجال

ظلمت و ظلم کہاں تیرے قلمرو میں رہیں
تجھ سا جب مسندِ اقبال پہ ہو مہرِ جمال

عندلیبانِ خوش الحاں ہیں چمن میں خوش خوش
ڈر خزاں کا ہے، نہ صیاد کا کچھ دل میں خیال

گرگ کو کہتے ہیں چوپایے کہ جاتا ہے کہاں؟
شیر کو دیکھ کے، پاس اپنے بلاتے ہیں غزال

جلوہ گر شام میں ہے، صورتِ صبحِ امید
اِس زمانے میں نہیں مہر کو آسیب زوال

تو وہ بزمی ہے کہ ہمسر نہیں پرویز ترا
تو وہ رزمی ہے کہ رستم کو نہیں تابِ جدال

بحرِ زخّار، ترے علم کی تشبیہ ہے تام
بارِ احساں ہے، ترے حلم کی گویا تمثال

جو تری رائے ہو، اُس میں غلطی کیوں کر ہو
تجھ پہ کھُل جاتا ہے آغاز میں ہر شے کا مآل

فخر کیوں کر نہ ارسطو کو ہو یکتائی کا
تجھ کو دانش میں ارسطو سے اگر دیجے مثال

کیا بیاں اسپِ سبک بار کی تیرے رفتار
گرد کے ساتھ پہنچتا نہیں صرصر کا خیال

کیا لکھے فیل کے اوصاف ترے، مدح نگار
کہ بلندی میں ہے کیواں، تو وہ پیکر میں جبال

عرض کرتا ہوں غزل شوقِ غزل سنجی میں
گو کہ مانع ہے مجھے، میری پریشانیِ حال

غزل

فتنۂ حشر سے بڑھ کر ہے اگر یار کی چال
اپنے نالے بھی کچھ اچھا نہیں رکھتے ہیں مآل

غم تو کیا، شوق بھی بے تاب کیا کرتا ہے
اپنے نزدیک تو ہے ایک فراق اور وصال

کہتی ہے لذّتِ سوزِ غمِ پنہاں مجھ سے
ہاتھ آجائے تو فردوس کو دوزخ ہی میں ڈال

وصلِ دلدار میسّر ہو، کہ موت آجائے
اے فلک کوئی تو ارمان ہمارا بھی نکال

نگہِ شرم کہے دیتی ہے سارے اسرار
آپ ہم بزمیِ دشمن کا نہ کیجے اقبال

چپ اُسے دیکھتے ہی رہ گئے اہلِ محشر
جرمِ الفت کا کسی نے نہ کیا ہم سے سوال

خاک ہونا تھا ہمیں کوئے بتاں میں آکے
قیس و فرہاد کو الفت نے دیے دشت و جبال

مدح سنجی میں اِن اشعار سے کیا مطلب تھا
لیکن اس پردے میں منظور ہے عرضِ احوال

تو کرے ذرّہ نوازی، تو شرف حاصل ہو
ورنہ یاں کوکبِ امید کو حاصل ہے وبال

شرم آتی ہے بیاں کرتے ہوئے حسنہ دلی — میری صورت ہو بیاں ہے مری صورتِ حال

جب وظیفہ ہو مرا بند، تو پھر اے داور — رمضاں کیوں نہ رہے غرّۂ ماہِ شوّال

جز ترے فیضِ کرم کے نہیں چارہ کوئی — کر دیا چرخ نے سب خرمنِ راحت پامال

ابرِ بخشش کو ذرا حکم، کہ برسے مجھ پر — تاکہ سرسبز ہو پھر میرا ریاضِ آمال

غور کر غور، کہ کیوں کر سخن آرا ہو زباں — دل ہی قابو میں نہیں ہو، تو ہو کیا تابِ مقال

جی میں سب کچھ ہے، مگر، ختمِ دعا پر ہے سخن — کہ ہے شادؔاں کی زباں کثرتِ آلام سے لال

تا رہے بے ہنروں کو حسدِ اہلِ ہنر (ق) — نظرِ اہلِ جہاں میں رہے تا قدرِ کمال

تیرے حسّاد ہوں، پامالِ ہجومِ ادبار — تیرے احباب کے سر پر رہے ظلِّ اقبال

مجھ سے حیرت میں سوا کیوں نہ ہو قاتل میرا — دیکھتا کوئی تڑپنا دمِ بسمل میرا

آئنہ دیکھ کے کہتے ہیں یہ منہ پھیر کے وہ — کوئی کھینچے لیے جاتا ہے اُدھر دل میرا

بے خودی میں ہے تجسّس مجھے اپنا، لیکن — اک قدم بھی نہیں پڑتا سوے منزل میرا

کثرتِ غم سے نہیں کوئی جگہ سینے میں — پھر بھی دے وہ ستم گار اگر دل میرا

حد سے ہر چیز کو ہے بڑھ کے زوالِ بیحد — سہل ہے، کام جہاں تک کہ ہو مشکل میرا

جستجو اپنی حقیقت کی ازل سے ہے، دلے — ہوں میں وہ بحر، کہ پیدا نہیں ساحل میرا

آئینہ توڑ کے کہتا ہے وہ مغرورِ جمال — اور بھی کوئی جہاں میں ہے مقابل میرا

ناز کرنا تو ذرا اس پہ سمجھ کر کرنا — آپ کی طبع سے نازک ہے سوا دل میرا

پہلے ہی مستِ مے عشق سے ہے دل میرا — بے خودی کام نہ کر اور بھی مشکل میرا

خود بخود گم ہوے جاتے ہیں مرے ہوش و حواس — پھر مجھے دیکھیے لے جائے کہاں دل میرا

میری آشفتگیِ طبع کہے دیتی ہے — حشر تک زلف کے پھندے میں رہے دل میرا

یہ بھی ہو جائے گا کاکل میں شکن کی صورت — کوئی نقصاں نہیں، رکھ لوگے اگر دل میرا

پردہ اُٹھا ہوا ہے رُخِ پُر جمال کا — اُڑتا ہے آج رنگ ہمارے خیال کا

کس کی زباں پہ ذکر نہیں میرے حال کا — باعث ہوئی ہے میری خموشی مقال کا

میری نگاہِ شوق پھر آئی، مگر کہیں — نظّارہ ساز غیر ہے، اُس کے جمال کا!

کیا اِس پہ پڑ گئی کوئی اس کی نگاہِ شوخ؟ — بدلا[1] ہوا ہے طور جو قاصد کی چال کا

ٹھوکر سے اُس کی، خاک پہ ملتا نہیں دماغ — ہے آسماں پہ پانو، ہر اک پایمال کا

ہم بے خودوں سے دور ہے یہ بزمِ آگہی — دل بجھ گیا ہے سینے میں شمعِ خیال کا

تابش اگرچہ مہر میں ہے، لیکن اے فلک — دیکھا کہاں ہے سینہ کسی خستہ حال کا

اُڑنے سے رنگ کے، یہ شبِ وصل وہم ہے — بگڑے نہ رنگ اور بھی صبحِ وصال کا

ایسا نہ کیجو ضعف، کہ اُس در کی راہ میں — دم ٹوٹ جائے غیر کے گھر پر خیال کا

---

[1] خ، بدلا ہوا جو طور ہے۔

ہیں اہلِ بزم ہاتھ جگر پر دھرے ہوئے
کچھ ذکر آگیا ہے وہاں میرے حال کا

کس ناتواں کا سایہ پڑا روزِ ہجر پر
سو حشر ہو کے وقت نہ پہنچا زوال کا

خاموشی اک بیاں ہے مرے رازِ عشق کو
رنگِ شکستہ آئنہ ہے میرے حال کا

صد خامشی نہ ایک مرا حرفِ مدّعا (کذا)
قایل ہوں آپ اپنی میں طرزِ مقال کا

اب تک تو بے خودی سے نہیں مجھ پہ کچھ کھُلا
مشتاق گو ازل سے ہوں میں اپنے حال کا

اُٹھا میں سُن کے غلغلۂ حشر کو عبث
دھوکا ہوا مجھے اُسی کافر کی چال کا

پرتو فگن ہے حسن کسی کا جو سینے میں
کچھ رنگ اور ہی ہے ہمارے خیال کا

اے اہلِ بزم! خاک کو میری نہ پھینکنا
پروانہ ہوں کسی کے فروغِ جمال کا

بیمارِ رنجِ ہجر ہے، بچنا محال ہے
یہ ماجرا ہے آپ کے شاداں کے حال کا

عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا
آئینہ بن گیا ہوں کسی کے جمال کا

کیا پوچھتے ہو حالِ دلِ پایمال کا
مشتاق پھر ہے ایک قیامت کی چال کا

ہم تو شبِ فراق ہی میں ہو گئے تمام
دینا پڑا حساب نہ کچھ ماہ و سال کا

سب انقلاب اُسی کی نگہ کے (ہیں) دہر میں
پابند ہے فلک تو وہی ایک حال کا

میں کہہ رہا ہوں اپنی سیہ بختیِ فراق
چہرہ سفید کیوں نہیں شامِ وصال کا

نورِ نظر تلاش میں یوسف کی کھو دیا
اللہ رے شوق دیدۂ عاشق جمال کا

واں خامشی نے قفل دہن پر لگا دیا
یاں شوق سے ہجوم ہے لب پر سوال کا

کثرت سے حسرتوں کی ملا اور تازہ غم
دل میں مرے گزر نہیں اس کے خیال کا

میں نالہ کرتے کرتے جہاں سے گزر گیا
واں ذکر بھی ہوا نہ کبھی میرے حال کا

ہاں زلفِ یار! تو نے رکھا دل کو میہماں
احساں ہے میرے سر پہ ترے بال بال کا

سنتے بھی جاؤ، آئے ہو مدّت کے بعد تم
قصّہ ہے مختصر سا مری عرضِ حال کا

بھڑکے اگر چراغ تو ہستی تمام ہو
ہر چیز کا کمال ہے باعث زوال کا

اس بے کسی سے جان نہ کیوں کر لبوں پہ آئے
رونا پڑا ہے آپ مجھے اپنے حال کا

شاداں کو کچھ گرا ہوا سمجھو نہ اہلِ بزم
یہ شخص بھی جہان میں ہے اب کمال کا

منظور جب سے یار کا وصفِ دہن ہوا
عنقا مثال گم مرے مُنہ میں سخن ہوا

مجھ کو ہی چارہ گر پہ نہ آئی فقط ہنسی
زخمِ جگر بھی دیکھ کے کچھ خندہ زن ہوا

تم اور شریکِ محفلِ اعدا! غلط غلط
میں اور یہ خیال! یہ کیا تم کو ظن ہوا؟

میرا ہی لاغری سے نہ پایا نشاں مگر
کیا کیا نہ تنگ میرے لیے پیرہن ہوا

ہوں وہ گرفتہ دل کہ کبھی میرے حال پر
زخمِ جگر بھی تو نہ مرا خندہ زن ہوا

جُنبش زباں کو سامنے اُن کے نہ ہو سکی
سو داستانِ ہجر مجھے اک سخن ہوا

ہوتے وہ بات بات پہ دشمن سے ہم کلام — حکمت یہ ہو گئی کہ نہ ان کے دہن ہوا
چیں پڑ گئی جو اُس کی جبیں پر عتاب میں — بے چین نازکی سے وہ نازک بدن ہوا
ممکن نہیں اشارے سے اقرار وصل کا — کچھ خامشی سے آپ کا ثابت دہن ہوا

جب خامشی کے واسطے پیدا دہن ہوا — کس منہ سے یہ کہوں کہ وہ پیماں شکن ہوا
مضبوط ہو کے ٹوٹ گیا رشتۂ حیات — وہ شوخ وعدہ کر کے جو پیماں شکن ہوا
سوجائے ٹھہرتا ہے نقاہت سے تا بہ لب — اب تو ہمارا نالہ بھی اُن کا سخن ہوا
منہ دیکھتے ہیں بزم میں حیرت سے سب کے سب — عارض تمہارا آئینۂ انجمن ہوا
سمجھے تھے قتل ہو کے سبکدوش ہو گئے — تن پر ہمارے بوجھ، ہمارا کفن ہوا
اُس کو تو کاٹنا تھا زمانہ فراق کا — فرہاد بے سبب تو نہیں کوہ کن ہوا
میری زبان بھی کھنچنے لگی مجھ سے خود بخود — وہ بے وفا جو مجھ سے ذرا ہم سخن ہوا
میرے جلانے کو وہ سناتے ہیں بعد قتل — اغیار کی طرف سے تمہارا کفن ہوا
شاداں بھلا تم ایسے کہاں کے ہو خوش بیاں — لوگوں کو کیوں پسند تمہارا سخن ہوا

نہاں پاتا ہے نظروں سے جو وہ ظالم دہن اپنا — تو بس حکم قضا ہی جانتا ہے ہر سخن اپنا
میں کس صورت سے واں جاؤں، وہ کیونکر مجھ کو بلوائیں — مجھے رشکِ عدو مانع، انھیں پاسِ سخن اپنا
یہ شدت ناتوانی کی، یہ عادت ہے خموشی کی — کہ دم لیتا ہوا آتا ہے لب تک ہر سخن اپنا
وہ کہتے ہیں کہ ہاں اقرار کر کے ہم مکرتے ہیں! — کہ جو چاہا کہا ہم نے، زباں اپنی، دہن اپنا
نہاں رہتا ہے مطلب بھی دہن پوشیدہ ہونے سے — کہ کھوئے جاتے ہیں پہروں وہ خود کہہ کر سخن اپنا

یاد وہ مجھ پر مہرباں، یا غیر پر برہم ہوا — آج درد دل مرے سینے میں کچھ کچھ کم ہوا
اتنے غم لکھے تھے قسمت میں مری روز ازل — مجھ پہ وہ گزرا ہوا ہے، جو کسی کو غم ہوا
سوچکے جب ہم تو کی تاثیر آہ و نالے نے — پوچھتا ہے وہ کہ اس کا شور غل کیوں کم ہوا
حالِ دل کس سے کہوں اب، وائے قسمت کیا کروں! — باتیں سن سن کر مری، مجھ سا مرا ہمدم ہوا
بڑھ گئی میری سیہ بختی سے اُس کی تیرگی — میرے مرنے کا شبِ ہجراں کو بھی ماتم ہوا
درد و غم سارے جہاں کے ایک اس میں جمع ہیں — سینۂ عاشق نہ ٹھہرا، خانۂ ماتم ہوا
سو جگہ رک رک کے آئی تا بہ لب میرے دعا — میرے سینے میں شبِ غم، یہ ہجومِ غم ہوا
جب ہوئی حد سے فزوں تکلیف، راحت ہو گئی — درد اتنا بڑھ گیا میرا کہ گویا کم ہوا
بھیج کر خط اُس کو، شاداں کیا خوشی حاصل ہوئی! — اور الٹا نامہ بر کا ہم کو رنج و غم ہوا

ہے رنگِ عشق رخ سے عیاں، دیکھ لیجیے — یہ درد دل نہیں کہ سنایا نہ جائے گا

مطلب یہ بے خودی سے ہے ہم کو، کہ کوئی شخص
پوچھے اُسے، تو ہم سے بتایا نہ جائے گا

قاصد کے آتے آتے، ہم اتنے ہوئے ضعیف
اک حرف اُس کے خط کا اُٹھایا نہ جائے گا

ذوقِ نظارہ سے نہیں باقی ادب کا نام
سر مجھ سے زیرِ تیغ جھکایا نہ جائے گا

شاداںؔ نے دل لگا کے بتوں سے بُرا کیا
اُس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

جب تک نہ آیا سامنے، کھولی نہ اپنی آنکھ
یعقوب کو یہ شوق تھا یوسف کی دید کا

ہاں اضطرابِ شوق! ذرا تھم، کہ بے طرح
دامن چلا ہے ہاتھ سے صبر و امید کا

جو رُخ نقاب میں نظر سوزِ وہم ہو
کیا حوصلہ نگاہ کو ہو اُس کی دید کا

کیا سارے ظلم ہو چکے اے چرخ؟ دیر سے
میں منتظر ہوں آج جفائے جدید کا

اے شیخ! دیر و کعبہ میں کیا امتیاز ہے؟
کچھ فرق ان میں ہے تو قریب و بعید کا

میں روزِ وعدہ کو بھی، شبِ غم گنا کیا
چھایا یہ دودِ آہ دلِ نا امید کا

دیکھوں کبھی جو صورتِ شامِ وصالِ یار
پھر دیکھنا نصیب نہ ہو صبحِ عید کا

پوچھے ہزار داورِ روزِ جزا، مگر
میں اور شکوہ اُن کی جفائے شدید کا!

خط پرزے پرزے، اور ہوا قتل نامہ بر
عنوان یہ ہوا مرے خط کی رسید کا

تھا شرمِ سخت جانی سے ایسا عرق عرق
خنجر سے گر رہا ہے پسینہ شہید کا

وہ خفتہ بخت ہوں کہ شبِ ہجر کے سوا
دیکھا کبھی نہ خواب میں منہ صبحِ عید کا

پوچھا نہ بعد عشق کے کسی نے کلیم سے
باقی ہے حوصلہ ابھی کچھ اُس کی دید کا

کچھ بھی تو اُن کے قول کو دیکھا نہیں ثبات
اے دل ہو خاک ہم کو بھروسا امید کا

غیر اور ایک تازہ خوشی لحظ لحظ، ہائے!
میں اور ایک رنجِ زمانِ مدید کا!

آیا ہے آج میری طرح وہ بھی بد حواس
قاصد سے خاک لطف ہے گفت و شنید کا

ہے مژدۂ وصل اب مجھے پیغامِ قضا کا
عادی ہوں غم و رنج کا، خوگر ہوں جفا کا

خلوت میں زلیخا سے چھڑا دامنِ یوسف
اچھا جو ذرا ہاتھ پڑا بختِ رسا کا

چھوٹے نہ غم و رنج سے ہم بعدِ فنا بھی
ہے تعزیتِ عشق، تو ماتم ہے وفا کا

نازک ہے وہ کتنا کہ تصور میں بھی میرے
آنکھوں سے اٹھایا نہ گیا پردہ حیا کا

یاں صنعت سے رنگ اڑ نہ سکا، اور وہ سمجھا
ہے رنگ کچھ اچھا ہدفِ تیرِ قضا کا

ہے فتح ہزیمت بھی بتوں کی، کہ جہاں کو
پھر ناصفِ مژگاں کا ہے پیغامِ قضا کا

محشر کو سنے گا نہ کوئی صور کی آواز
ہے شور جو یہ ہی مرے نالوں کی صدا کا

پایا نہ فروغ آگے شبِ ہجر کے ہرگز
چمکا نہ ستارہ سحرِ روزِ جزا کا

اُس گل کا تصور تھا جو آنکھوں میں دمِ نزع
گویا دمِ آخر مرا، جھونکا تھا صبا کا

لہ یہاں سے، آخر دلیف الف تک، جملہ اشعار خمخانۂ جاوید سے ماخوذ ہیں۔

وہ معنیِ روشن کی تجلّی ہے کہ شاداںؔ
باطن ہے، ہر اک شعر مرا، اہلِ صفا کا

تری لافِ نازکی کا مجھے اعتبار ہوتا
ترا تیرِ او ستمگر جو نہ دل کے پار ہوتا
تری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا
مجھے موت زندگی پر اگر اختیار ہوتا
انھیں بے حجابیاں تھیں مری بیخودی کے باعث
کبھی آپ میں نہ آتا، جو میں ہوشیار ہوتا
مری خاک ہو تسلّی ترے وعدۂ غلط پر
تجھے گر ہنسی نہ آتی، مجھے اعتبار ہوتا

مدد اے بخت! کہ سب کام بنے جاتے ہیں
گر یونہی کچھ اثرِ نالۂ و شیون رہا
مژدہ اے یاس! کہ پھر آئی مصیبت دل پر
حسرت اے دل! کہ اُنھیں وعدہ نہ پھر یاد رہا

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ
ہم پر یہ ستم ہے، کہ سوا ہو نہیں سکتا

دلِ مضطرب کا ہے اپنے قصور
نشانہ جو اُن کا خطا ہو گیا

نہ جاگا روزِ جزا میں بھی خوابِ شیریں سے
ہنوز طالعِ خفتہ ہے نوجواں میرا

سرِ مرا حبب کہ تہِ زانوِ قاتل آیا
اک مزہ وصل کا مجھ کو دمِ بسمل آیا
اُس کے کوچے سے نہ نکلا کوئی بچ کر ہرگز
کشتہ نکلا کوئی واں سے، کوئی گھائل آیا
ایک سکتے کا سا عالم ہوا سب کو شاداںؔ
آج محفل میں جو وہ حور شمائل آیا

ہے تصوّر میں ہمارے، روئے دلبر کا جواب
بن گیا ہے دل بھی اپنا آئنہ گر کا جواب
پڑھ کے میری داستانِ شوق، قاصد سے کہا
خامشی سے بڑھ کے کیا دوں ایسے خط کا جواب
بختِ خفتہ نے شبِ فرقت میں کروٹ بھی نہ لی
گرچہ نالہ بن گیا ہے صورِ محشر کا جواب
کچھ کہا ایسا کہ قاصد کہہ رہا ہے دیر سے
کیونکے نکلے میرے منہ سے اُس ستمگر کا جواب
چھُپ گئے ہم آنکھ سے ساقی کی دورِ بزم میں
ہو گئی تقدیر گردش دے رہا ساغر کا جواب
گم نگاہوں سے کیا یہ ناتوانی نے مجھے
سایۂ عنقا نہیں ہے جسمِ لاغر کا جواب
نامہ بر راہِ عدم ہے کوچۂ جاناں کی راہ
حشر میں سُن لینگے تجھ سے اُس ستمگر کا جواب
حشر تک ہوتا نہ دیدارِ رُخِ جاناں نصیب
آئنہ ہوتا اگر میرے مقدّر کا جواب
جذبِ شوقِ قتل سے لب تک مگر آتا نہیں
دل میں میرے پھر رہا ہے اُس کے خنجر کا جواب
کوہ کن نے عمر کاٹی اپنی اس امید پر
پر نہ نکلا اک در شیریں کے پتھر کا جواب
اضطرابِ شوق سے کرتا ہوں میں پیہم سوال
ایک بھی پورا نہیں ہے اُس ستمگر کا جواب

عکس سے اُس سنگدل کے، صورتِ دل ٹوٹ جائے — آئنہ بن جائے گر سدِّ سکندر کا جواب
جس[1] کے نقشِ پا پہ شاداں ہوتے ہیں فتنے نثار — ہو کہاں سکتا ہے محشر اس کی ٹھوکر کا جواب
بھول جاؤ گے سب خوشی شاداں (رخ) — کسی غمگیں سے جب ملیں گے آپ

کس جائے ہو امیرے تصوّر کا گزر آج! — آتی نہیں جو اپنی حقیقت بھی نظر آج
بے کس کوئی دنیا سے ہے سرگرمِ سفر آج — اے بے خبری! تجھ کو کسی کی ہے خبر آج؟
ہیں شامِ شبِ وصل میں آثار سحر کے — ملتا ہے شبِ غم کی دعاؤں کا اثر آج
آتے ہیں وہ بے پردہ قیامت ہیں یہ ہے چون — بن جائے نہ موسیٰ کی نظر، میری نظر آج
پیدا ہوا کیا اور کوئی روزِ مصیبت — آتی ہے نظر کیوں شبِ ہجراں کی سحر آج
اس موت پہ قربان کروں زندگیِ خضر — اس کوچے میں پہنچی مرے مرنے کی خبر آج
کل ہو کے دوچار اُس نگہِ شوخ سے یارب — آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج
وہ دیکھنے آتے ہیں مرے حالِ زبوں کو — اچھا ہے جو بڑھ جائے مرا دردِ جگر آج
رخصت ہوئے جاتے ہیں مرے ہوش خرد کیوں — اے بے خودیِ شوق! ارادہ ہے کدھر آج!
برسوں میں نظر آئی ہے شامِ شبِ عشرت — یارب رہے کچھ دور گماں سے بھی سحر آج
روتا ہے مرے حال پہ کیوں چارہ گر اتنا — اشکوں سے نہ بھر جائے مرا زخمِ جگر آج
دیکھا ہے مری بے خودیِ شوق کو تو نے — قاصد نہ رہے گی تجھے اپنی بھی خبر آج
گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن — دوڑی ہوئی جاتی ہے جو شی غیر کے گھر آج
برسوں میں ہوا سامنا محشر میں جو مجھ سے — منہ دامنِ خجلت سے چھپاتی ہے سحر آج
یاں جنبشِ لب کی بھی نہیں ضعف سے طاقت (رخ) — مشتاق ہے گو میری دعاؤں کا اثر آج
پڑ جائے اگر سروِ قدِ یار کا سایہ (〃) — آجائے مرے نخلِ تمنا میں ثمر آج
وہ جو گرِ غم ہوں کہ بھر آئے وہیں آنسو (〃) — مجھ پہ متبسم جو ہوا زخمِ جگر آج
کل تک بھی مجھے تاب تھی کچھ کہنے کی شاداں (〃) — کہتے ہیں وہ سننے کو مرا دردِ جگر آج

افعیِ کاکل کی تو تصویر کھینچ — گرد میرے حلقۂ زنجیر کھینچ
آرزو کوئی نکل جائے نہ ساتھ — میرے سینے سے نہ قاتل تیر کھینچ
ہم نشیں دیکھی مری دیوانگی — اور پاؤں سے مرے زنجیر کھینچ
بد دعا عشاق کی اچھی نہیں — دور اپنے کو نہ اے تاثیر کھینچ

---

[1] مصرعِ اول مطابق خم خانہ ہے۔ مخطوطے میں یہ اس طرح ہے ع اس کے نقشِ پا پہ فتنے ہوتے ہیں شاداں نثار۔

نہ پہچانا[1] اُس نے مجھے روز وعدہ — خوشی نے دیا رنج صورت بدل کر
ٹھکانا نہ ہو جب کسی دل میں اے دل — کہاں جائے سینے سے ارماں نکل کر
گرا ہے ابھی نالہ ناطاقتی سے — ذرا دل سے اے آہ اٹھنا سنبھل کر
عضب نارسائی کا مضموں ہے حظ میں — کہ پھر آیا قاصد بھی کچھ راہ چل کر
دلِ مضطرب بھی ہے پہلو میں قاتل — ذرا پاؤں سینے پہ رکھنا سنبھل کر
پھر آنا نزاکت سے دشوار ہوگا — نہ جاؤ مرے دل سے باہر نکل کر
رگِ جاں گلے مل رہی ہوگی شاید — رُکی ہے جو تلوار قاتل کی چل کر
ٹھہرتی ہے سو جائے ناطاقتی سے — نگہ بھی مری آنکھ سے اب نکل کر
چھپائے ہوئے دامنِ شب سے منہ کو — شبِ غم گئی صبحِ محشر نکل کر

یہ بھری ہوئی تھی شوخی کہ تمہارے گھر سے یاں تک (رخ)، کہیں نامہ بر کے منہ پر نہ رکا جواب ہرگز

ہوئے دوچار اپنے عکس سے وہ نہ پیشِ آئینہ کوئی صورت (رخ)، کہ بن گئی تھی نگاہِ شوخ اُن کے حق میں، اُن کی نقابِ عارض

شبِ ہجراں میں یہ تڑپا میں سحر ہونے تک — مل گیا خاک میں اُس بُت کو خبر ہونے تک
گر یہی جنبشِ مژگاں کے اشارے ہوں گے — دل نکل جائے گا پہلو سے نظر ہونے تک
وہ یہ کہتے ہیں، جو کرتے ہو دعا بھی کر لو — ہم مزہ تم کو دکھا دیں گے اثر ہونے تک
تم تو آتے ہی رہے بہرِ عیادت، اور ہم — مر گئے چارۂ آزارِ جگر ہونے تک
مژدۂ وصل ہی لاتا ہوا اگرچہ قاصد — کیا بچوں گا ترے آنے کی خبر ہونے تک
رفتہ رفتہ رُخِ تاباں سے اٹھاؤ پردہ — چاہیے عرصہ مجھے تابِ نظر ہونے تک
دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے اُن[2] سے اچھی — رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہونے تک
شام تک گریہ و زاری میں بسر ہوتی ہے — اور کبھی جان پہ بنتی ہے سحر ہونے تک
حلد شاداں کی خبر لے کہیں ظالم! ورنہ (رخ) — گزرے گا جان سے وہ تیر اگر ہونے تک

جس آرزو کا مقدر میں خانہ بر آنا (رخ)، وہی ہوئی دلِ ناکامیاب میں داخل

کب میں ہر وقت خیالِ قدِ جاناں میں نہیں — کب قیامت مرے سر پر شبِ ہجراں میں نہیں
جیسے دو نعلیوں میں اثبات ہے ثابت، بدعہد! — ہم نے اکثر یونہی دیکھی تری ہاں ہاں میں نہیں
نظر آتا ہی نہیں تجھ سا کوئی اور مجھے — ورنہ کیا کچھ مرے اِس دیدۂ حیراں میں نہیں

---

[1] خمخانہ میں یہ مصرع یوں ہے ع شبِ وعدہ اس نے نہ پہچانا مجھ کو۔ [2] مصرع مطابق خم خانہ درج کیا گیا ہے، مخطوطے میں "یا شمع ہے بہتر اُن سے" ہے۔

کیسے لے جاؤں گناہوں کو قیامت میں خدا
اتنی وسعت نظر آتی مرے داماں میں نہیں

ہاتھ میرا جو گریباں پہ بڑھا جاتا ہے
غیر کا منہ تو کہیں اپنے گریباں میں نہیں

ہر لحظہ سدِّ راہ جو میری فغاں کے ہیں
سینے میں یہ بھرے ہوئے ارماں کہاں کے ہیں

بدنامی[1] اُس کی کھوئی مرے دودِ آہ نے
پردے میں اب تو مجھ پہ ستم آسماں کے ہیں

جاگا ہے پاسبانِ درِ یار رات بھر
الٹے اثر نصیب میں میری فغاں کے ہیں

رنج ایک دل میں میرے زمانے کے بھر گئے
دل ایک زلف میں تری، سارے جہاں کے ہیں

میں ناتواں ہوں اور وہ نازک شبِ وصال
پردے کبھی نہ اٹھیں گے جو درمیاں کے ہیں

اے ضعف! دیکھ بھال کے مجھ کو گرائیو
نزدیک دشمنوں کے بھی گھر اس مکاں کے ہیں

کیا اُن سے اُٹھ سکیں گی نہ باتیں رقیب کی؟
میں بھی تو دیکھوں ایسے وہ نازک کہاں کے ہیں

میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا
وہ پوچھتے ہیں[2] مجھ سے یہ قصّے کہاں کے ہیں

گھر سے گئے ہیں یا کہیں باہر سے آئے ہیں
کچھ ہوش آج بگڑے ہوئے پاسباں کے ہیں

کس نازکی سے آتے ہیں میری خبر کو وہ
گویا قدم یہ مجھ سے کسی ناتواں کے ہیں

روتے ہیں آ کے قبر پہ غیروں کے ساتھ وہ
کیا کیا مٹانے والے ہمارے نشاں کے ہیں

کافی ہے نیند بھرنے کو میری شبِ فراق
گو خواب میرے بخت کو سارے جہاں کے ہیں

دیکھا ہے میں نے خوب مریدوں کو شیخ کے (رخ)
اچھے وہی ہیں، یار جو پیرِ مغاں کے ہیں

پہلو میں میرے اور یہ پیدا ہوا رقیب (〃)
آثارِ عشق، رخ پہ مرے رازداں کے ہیں

غم ایک میرے دل میں زمانے کے بھر گئے (〃)
دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں

اے برق وہ جلائے گی کیا آہِ آتشیں (〃)
تنکے بچے ہوئے جو مرے آشیاں کے ہیں

شادؔاں چھپائے لاکھ، پہ چھپتے بھی ہیں کہیں (〃)
آثار اُنس کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

آفت کا توڑ ہے ترے تیرِ نگاہ میں
پیدا اثر کہاں سے ہو عاشق کی آہ میں

آمد جفائے تازہ کی اتنی ہے چرخ سے
جاتا ہے میرا نالہ، تو رُکتا ہے راہ میں

یہ ناتواں ہوا ہوں کہ اب کوئے یار تک
میری نظر بھی جائے، تو رہ جائے راہ میں

شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار
کل کی سی بات ہی نہیں طرزِ نگاہ میں

دیکھی ہوئی ہے تیری درازی شبِ فراق!
کیوں آئے روزِ حشر ہماری نگاہ میں

کیا بھید ہے کہ روز وہ آ کر یہ کہتے ہیں
بتلا تو، کچھ اثر بھی ہوا تیری آہ میں؟

سایہ ہوا ہے غیر کی محفل کا دودِ آہ
لکھا ہوا تھا یہ مرے بختِ سیاہ میں

تعزیر اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں بار بار (رخ)
ملتی ہیں راحتیں مجھے کیسی گناہ میں

---

[1] رخ، بدنامی اس کی کیوں کی مرے دردِ آہ نے۔ [2] رخ، وہ پوچھتے ہیں مجھ سے وہ نازک کہاں کے ہیں۔

بچتے ہیں دور کر کے مری خاک کا گماں (خ) اُڑتی ہوئی جو دیکھتے ہیں گرد راہ میں
میں اِن بتوں کے عشق میں یاں تک سبک ہوا (ر) اب خود نہیں سماتا ہوں اپنی نگاہ میں
یہ ناتواں ہوا ہوں کہ اب کوئے یار تک (ر) نالہ بھی میرا جائے تو سو جائے راہ میں
ہے کس بھروسے پر تمہیں شادؔاں امیدِ وصل؟ (ر) ہے نالے میں اثر، نہ ہے تاثیر آہ میں

رشک کی بھی ہمیں تو تاب نہیں — شکر ہے، غیر پہ عتاب نہیں
لطفِ دیرینہ، خاک یاد رہے! — ستمِ تازہ کا حساب نہیں
ابھی لب پر ہے حالِ دل میرا — ہم نشینوں کو میرے تاب نہیں
کیا تغافل کا تھا کوئی مضموں — یا دِ قاصد کو کچھ جواب نہیں
ہے ترقیِ حُسن ہی پردہ — کچھ اسے حاجتِ نقاب نہیں
اُس کی شوخی سے کم نہیں شبِ وصل — گرچہ پہلا سا اضطراب نہیں
بے خودی کام آگئی آخر — کہ انھیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں
اُس نے پوچھا تو کیا بتاؤں گا؟ — حسرتوں کا مری حساب نہیں
چپ ہوں سُن کر یہ ایک بات اُس کی — کہ مجھے طاقتِ جواب نہیں
پھرتی ہے کوئی چیز آنکھوں میں (خ) یہ مرے بخت کا تو خواب نہیں
خیر ہو آج بزم کی شادؔاں (ر) کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

ستم سہنے کی جب تاب و تواں ہو — یہی کیوں ہو، کوئی اور آسماں ہو
قدم رکھیں نہ ہم تو آسماں پر — جو سر رکھنے کو تیرا آستاں ہو
جو وہ پہلو میں میرے ہو تو کیونکر — نہ میری بے خودی سے بدگماں ہو
نہ دنیا میں نہ عقبا میں ہو یارب — شبِ عشرت سحر ایسی نہاں ہو
اُنھیں آئینے سے ہے بدگمانی — ہمارا حالِ دل کیوں کر عیاں ہو
شبِ غم کی مصیبت کا بیاں ہے — ہماری ختم کیوں کر داستاں ہو
نزاکت سے زیادہ ہے تجلّی — وگرنہ تم تو نظروں سے نہاں ہو؟
ہماری ناتوانی دیکھنے کو — وہ آکر پوچھتے ہیں تم کہاں ہو
الٰہی ناز کی بڑھ جائے اتنی — کہ اُن کو ناز کرنا بھی گراں ہو
خیالِ آئینہ رہتا ہے ہر دم — کہیں ہو تم، مگر ہوتے کہاں ہو
نگاہِ شوق تم کو دیکھ لے گی — اگر تم لاکھ پردوں میں نہاں ہو
سہو جورِ سپہرِ پیر شادؔاں — ابھی فضلِ خدا سے تم جواں ہو

کہتے ہیں "عہد شکن سمجھے ہو کیا تم مجھ کو" — وعدے کے ساتھ جو آتا ہے تبسم مجھ کو
کوئی ہنگامہ ہے، یا گھر سے وہ نکلے ہیں کہیں — آج آتی ہے نظر کثرتِ مردم مجھ کو

ایک وہ ہیں کہ جو دل چاہے وہ کہتے ہیں مجھے
ایک میں ہوں کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو

کوئی سنتا نہ ہو، اس کی بھی ذرا فکر رہے
شکوۂ غیر سناتے ہو اگر تم مجھ کو

نالہ و آہ سے ہے رنجشِ جاناں منظور
مار ڈالے گی غلط فہمیِ مردم مجھ کو

بے قراری مری یہ، آپ کی شوخی وہ کچھ
میں تمہیں دیکھ سکوں گا نہ کبھی تم مجھ کو

اس قدر کی دہنِ یار کی میں نے تعریف
کہ بس آخر نہ رہی تابِ تکلّم مجھ کو

کہتے ہیں "دیکھتے ہیں آئینہ یوں ہی ہم بھی
جس طرح دیکھتے ہو آٹھ پہر تم مجھ کو"

میں جو کہتا ہوں کوئی چارہ گر آئے یارب
زخم بھی دیکھ کے کرتے ہیں تبسم مجھ کو

اب تو حالت مری پہنچی ہے کچھ ایسی شاداں
خود وہ کہتے ہیں کہ آتا ہے ترحّم مجھ کو

ساقیا جام کے بدلے، دے کوئی خُم مجھ کو (رخ) تاکہ اس بزم میں ہو تابِ تکلّم مجھ کو

اپنے کوچے میں بٹھا دو جو کہیں تم مجھ کو
بسترِ خاک بھی ہو مسندِ قائم مجھ کو

وہ ادا ہے، نہ وہ غمزہ، نہ وہ شوخی، نہ وہ ناز
آج کچھ اور ہی آتے ہو نظر تم مجھ کو

پوچھتے ہیں کہ "تمنا تو بتاؤ کیا ہے"
جانتے ہیں کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو

جان و دل ہوش و خرد اس کے عوض میں لیلو
صبر ایک چیز ہے بے کار، وہ دو تم مجھ کو

کہتے ہو "خنجرِ ستم چھٹ نہیں سکتی مجھ سے
ورنہ آتا ہے بہت تجھ پہ ترحّم مجھ کو"

خندہ کیا ہے، نہیں معلوم، ولیکن گاہے
اپنے ہی حال پہ آتا ہے تبسّم مجھ کو

بے قراری تو کہے دیتی ہے رازِ پنہاں
یہ خموشی بھی ہے گویا کہ تکلّم مجھ کو

نیش سے چبھتے ہیں سینے میں مرے چار طرف
دل کے بدلے میں ملا ہے کوئی کنڈم مجھ کو

میری منّت پہ، شبِ وصل میں کچھ شرم کیا تھ
دیکھنا اُن کا وہ ہنگامِ تبسّم مجھ کو

ناتوانی نے کیا ہے یہ سبک نظروں میں (رخ) پُتلیاں پھیرتے ہیں دیکھ کے مُردم مجھ کو

تم بھی آجاؤ یکایک تو خبر دار نہ ہوں (〃) بے خودی نے شبِ عشرت یہ کیا گم مجھ کو

بے قراری مری یہ، اُن کی ہے شوخی وہ کچھ (〃) میں تمہیں دیکھ سکوں گا، نہ کبھی تم مجھ کو

حسرتِ گریہ گئی ہے، نہ کبھی جائے گی (〃) بخش دے رونے کو یارب کوئی قلزم مجھ کو

ساقیا اس ترے مے خانہ میں رکھا کیا ہے (〃) خُم گردوں کے برابر دے کوئی خُم مجھ کو

کام کیا ہم کو تری رہ میں، کسی رہبر کے ساتھ (رخ) جب تصور آگے آگے ہو دلِ مضطر کے ساتھ

لاگ اِس ظالم کو ہے ہر عاشقِ مضطر کے ساتھ (〃) گردشیں گردنِ دوں کی ہیں ہمارے سر کے ساتھ

اُن سے نازک کو نکلنے دے نہ قابو سے مرے (〃) اے طبیعت! ہاں الجھ اچھی طرح دلبر کے ساتھ

اپنی مرگ و زیست پر ہوتا جو ہم کو اختیار (〃) ہر ادا پر اُن کی مرتے، جیتے ہر ٹھوکر کے ساتھ

نعش پر منہ ڈھانکنے کا ہے بہانہ، ورنہ ہیں (〃) رنجشیں درپردہ وہ ہی عاشقِ مضطر کے ساتھ

خدمت اُس بُت نے بلا گردانیوں کی دی مجھے (〃) گردشِ نقدم سے نکلا مگر چکر کے ساتھ

ہے وہ نازک، خواب میں پہنچے نہ مجھ تک، گر نہ ہو (〃) جذبِ دل میرا خیالِ قامتِ دلبر کے ساتھ

ہو چکی شیشے میں مے، مجھ تک جو آیا دورِ جام (خ) گردشِ قسمت تھی اپنی گردشِ ساغر کے ساتھ
بے ستوں پر آ گئی صورت پرستوں کو نظر (،،) وہ جو اک نسبت دلِ شیریں کو تھی پتھر کے ساتھ
ظرف سے اپنے کہیں ساقی نکل جائے نہ مے (،،) گردنِ مینا جھکائے رکھ ذرا ساغر کے ساتھ
بے خودی نے ضعف میں مجبور ایسا کر دیا (،،) آپ میں آتا ہوں یادِ شوخیِ دلبر کے ساتھ
اضطرابِ دل نے اِس رہ میں بڑھایا وہ قدم (،،) نقشِ پا تک بھی نہیں میرا مرے رہبر کے ساتھ

وہ نازکی سے تصور میں آ نہیں سکتے — جو آ گئے، تو مرے دل سے جا نہیں سکتے
وہ پاسبانِ درِ یار تھا کہ جاگ اٹھا — ہمارے بخت کو نالے جگا نہیں سکتے
کسی کی سن کے کہیں کیا، یہ ناتوانی ہے — کہ بات کا بھی مزہ ہم اٹھا نہیں سکتے
وہ حال پوچھنے اُن کی طرف سے آئے ہیں — کہ ایک بات بھی جن کو سنا نہیں سکتے
ہمیں زمانے میں دل سوز مل نہیں سکتے — کسی کو داغِ جگر ہم دکھا نہیں سکتے
پہنچ نہ جائیں دلِ غیر میں کہیں یارب — کہ میرے سینے میں ارماں سما نہیں سکتے
یہ دشمنوں کی نظر کا ہجوم ہے شاداںؔ — کہ آنکھ بزم میں اُن کی اٹھا نہیں سکتے

وہ نالے میرے کہ جو لب تک آ نہیں سکتے — تمہارا رنگ وہ کیوں کر اڑا نہیں سکتے
دیا ہوا ہے یہ کس کا، کہ فرطِ رشک سے داغ — کسی کو ہم پئے درماں دکھا نہیں سکتے
پڑی ہیں رخ پہ تمہارے جہان کی نظریں — یہ پردہ وہ ہے کہ جس کو اٹھا نہیں سکتے
ہمارا حال کچھ ایسا بیاں سے باہر ہے — کہ لوگ جس کی کہانی بنا نہیں سکتے
رہے ہیں سینے میں گویا کہ آرزو بن کر — کہ نالے ضعف سے لب تک بھی آ نہیں سکتے
یہ تیرگی شبِ ہجراں کہاں سے لائی ہے — کہ عقل و ہوش کو ہم کھو کے پا نہیں سکتے
یہ کھاتے کھاتے غمِ ہجر بھر گیا ہے جی — کہ اپنا غم ہے مگر آپ کھا نہیں سکتے
وہ[1] رحم خاک کریں، نازکی سے ہیں مجبور — کہ ہاتھ میرے ستم سے اٹھا نہیں سکتے
یہ اپنے ضعف نے کیسا غضب کیا شاداںؔ! — خیالِ یار میں بھی اب تو جا نہیں سکتے

اُٹھ کر درِ جاناں سے کہو، کوئی کدھر جائے، — جی سے نہ گزر جائے، تو دنیا سے گزر جائے
دیدار میں وہ لطف، جسے دیکھ کے ہو زیست — رفتار میں وہ قہر، کہ جو دیکھے وہ مر جائے
ساغر کشِ میخانۂ توحید ہوں ناصح! — وہ نشّہ نہیں مجھ کو، جو باتوں میں اتر جائے
رنجوریِ الفت کا مری پوچھ نہ انجام — آغاز میں وہ درد ہے جو حد سے گزر جائے
کیونکر نہ بڑھے لطفِ شبِ وصلِ عدو کا — عارض پہ تری زلفِ پریشاں جو بکھر جائے
ڈر ہے کہ وہ تکفین کو اُس کی نہ چلے جائیں — یارب نہ عدو، میری شبِ وصل میں مر جائے

---

[1] خ، وہ خاک رحم کریں۔

آرائشِ ہر دم سے نہ ہووے جسے فرصت — شاداں کی پریشانی پہ کیوں اُس کی نظر جائے

بے تابیِ عشّاق سے کب تجھ کو خبر ہے — ہاں اپنے ہی کچھ حسن و نزاکت پہ نظر ہے
کیا روشنیِ بخت کا یارب یہ اثر ہے؟ — شامِ شبِ فرقت مری، ہم شکلِ سحر ہے
پردے میں بیٹھے ہو تم رخ کو چھپائے — دیکھے کوئی تم کو، یہ کسے تابِ نظر ہے
ہر صبح مجھے شامِ غریبی سے ہے بدتر — ہر شام مجھے ایک قیامت کی سحر ہے
کچھ دیکھے تو وہ ہی کمرِ یار کو دیکھے — جس کو (کی) مرے شعروں کے مضامیں پہ نظر ہے
کیوں آئینہ دیکھا کہ جبیں پر عرق آیا — اپنا سا ستم گار مگر مدِّ نظر ہے
شاداں نہ سہو رنج و الم عشقِ بتاں کے — اُس بات کو چھوڑو کہ تمہیں جس میں ضرر ہے

زلف کی بو ادھر نہیں آتی — کیا صبا میرے گھر نہیں آتی؟
نیند اُس بت کے ہجر میں ہم کو — شام سے تا سحر نہیں آتی
جب کہ وہ ہی نظر نہیں آتا — زندگی بھی نظر نہیں آتی

غیر لپٹا رہے وہاں برسے — اور یاں چشم سے لہو برسے
آئینے میں نظر پڑا ہے کیا — نظر آتے ہو کچھ مکدّر سے
حشر کا حال پوچھتے کیا ہو — دور کر دو نقاب رخ پر سے
چال اُن کی نہ دیکھیے شاداں — خوف کیجیے ذرا تو محشر سے

اُس کے جلوے کے تحیّر نے، تڑپنے نہ دیا — خاک ارمان ہمارے دمِ بسمل نکلے
آئنہ دیکھتے ہیں وہ تو بگڑ جاتے ہیں — چاہتے ہیں کہ نہ کوئی بھی مقابل نکلے
کیا زیادہ پیے ہر روز سے دو چار سبو — آج مے خانے سے شاداں جو بمشکل نکلے

چال ہی اُس کی نظر میں ہے، تو آفت کیا ہے — اُس کے قامت ہی کو دیکھا تو قیامت کیا ہے
ہائے بے تابیِ شوق اپنی شبِ وصل میں، اور — اُن کا اک ناز سے کہنا کہ مصیبت کیا ہے

یہ بار بار جو پیکاں کو دیکھتے ہو تم — (رخ) نکل گئی کوئی کیا آرزو مرے دل کی

مر جاؤں گا اک روز فغاں کرتے ہی کرتے (رخ) حالِ دلِ بے تاب بیاں کرتے ہی کرتے
پورا نہ کہا جائے گا حالِ تپِ ہجراں (〃) گزرے گی شبِ وصل بیاں کرتے ہی کرتے

محبت نے مجھے کھینچا کہاں سے (خ) کہ میں آیا زمیں پر آسماں سے
سنو! پُر درد ہے حالِ دلِ زار (،،) مزہ پاؤ گے تم اِس داستاں سے
بس اب خاموش، کیا کیا کہہ چکے ہو (،،) نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
تم اپنا رنگ آئینے میں دیکھو (،،) تمہیں کیا کام رنگِ عاشقاں سے
نشانہ دل ہے، بسم اللہ کیجے (،،) اگر کچھ شوق ہے تیر و کماں سے
بہت سی خاک چھانی تم نے شاداں (،،) قدم باہر نہ رکھو اب مکاں سے

دل کسی شخص پہ آجائے، تو کچھ حال کھُلے (خ) آپ کیا جانیں کہ عاشق کی طبیعت کیا ہے

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشاں دہلی (ف) کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

آغوشِ گور تنگ شد از بیقراریم ای دل! ز پہلو کہ جدا گشتہ ایم ما؟

شرم می آید خیالی را بجنگِ آسماں کاین جوانی ہست و او یک پیرِ دیرین سال است

چہ احتیاجِ نگہباں بعہدِ دولتِ او کہ پاسبانِ جہاں است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم، ناوکش خطا نہ کند رہا نکند سوی عنقا اگر بعزمِ شکار

غم نیز در خوشی است کہ فارغ شدہ زکار برجای خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است

قطعۂ تاریخ باقر علیخاں کامل

چو زین غمخانۂ دنیا سفر کرد سوی باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر گردید بود مینو مکاں باقر علی خاں
۱۲۹۳ھ

کلامِ باقر علی خاں کامل

اٹھانے پڑیں گے نہ ساقی کے ناز کہ پیرِ مغاں آشنا ہو گیا

یاد آنا کسی کے کاکل کا تیرہ سازِ شبِ جدائی ہے

مٹ گیا، پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی لب پہ دہلی ہے، تو نظروں میں ہے شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کہیں چرخ عیاں لیتا ہے اب مصیبت میں پڑے ہیں جو کسانِ دہلی

منہ کو اُبلا ہوا آتا ہے کلیجہ، ہے ہے!! ہم نشیں کیونکے بھلا کیجے بیانِ دہلی
جی بہارِ چمنِ دہر پہ کیوں کر دھریے کہ نظر آتی ہے افسوس خزانِ دہلی
غم دیے، رنج دیے، اپنی گرہ سے ظالم چرخ! کیا تو نے لیا، کرکے زیانِ دہلی
اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی؟
ضبط گریے کو یہ دلّی نے کیا ہے، گویا نہیں پائی گئی یہ نہرِ روانِ دہلی
سیل کے گولے پڑے، چرخ سے فتنے برسے منہدم کیونکے نہ ہو جائیں مکانِ دہلی
خانۂ کعبہ کو اب حضرتِ کامل چلیے رہنے کا اب نہ رہا لطف، میانِ دہلی

مسدس شہر آشوب

تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلعِ خورشیدِ نور تھی دہلی تمام غیرتِ صد کوہِ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فردِ بشر بُرا بھی یاں کا، زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا ذوق، خاصِ دُنیا پر یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی زر ہو کر
یہ فوج باغیہ کیا شہر میں خدا لائی
کہ قہر آیا، غضب آیا، اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں جو روز عیش میں گزرا، تو شب مسرت میں
پڑے ہوئے ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں! اور وہ بادشاہ کہاں!
رہا جو کوئی، تو وہ مرتبہ، وہ جاہ کہاں!

یہ قلعہ، رشک دہِ گلستانِ رضواں تھا یہ قلعہ خلد تھا، اِس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا، کہ خدایا! کوئی پرستاں تھا! یہ قلعہ، پیکرِ دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی، تو ہاں! دردِ دل عیاں کیجے صدائے طائرِ گم گشتہ آشیاں کیجے
حیات بخش کا، گر ماجرا بیاں کیجے تو چاہیے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے
یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لعل پردہ، کہ تھا جس سے احتشام عیاں خوشی سے خسروِ پرویز ہے جہاں دربان
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں کہ خاص خاص بھی جاتے تھے کس تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جاے اک جہان کے سر
قدم بھی اب نہیں دھرتا ہے واں کوئی جا کر

یہ وہی چوک ہے! میلہ تھا جس جگہ ہر روز — یہیں تو رہتے تھے مہ طلعتانِ دل افروز
نظر کو ہوتے تھی کیفیتِ سرور اندوز — جدھر کو دیکھیے تھی اک بہارِ کلفت سوز
نشان بھی نہیں اب تو ہجومِ خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقام عبرت کا

یہ وہ ہے مسجدِ جامع، کہ جس میں ایک جہاں — نماز کے لیے آتا تھا دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہوان کا بیاں — ادب سے کرتے تھے اُن کی زیارت اہلِ ماں
وہ اس کی رونقِ بازار چار سو مت پوچھ
کہ مجھ سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دیں دار ہے یہ فوج اور نہ دینداری — سیاہ رُوؤں کو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بھی بجز ستم کاری — حرام خوروں کو ہر دم تھا شغلِ مے خواری
تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ، سیکڑوں رہتے تھے جنکے ساتھ سوار — کیا پیادہ اُنھیں، اے سپہرِ ناہنجار!
اُٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کے کس طرح سے بار — اٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دشوار
تہِ زمین جگہ چاہیے اماں کے لیے
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیے

نہ چہچہے کوئی دم، اور نہ قہقہے کوئی آن — فسردہ دل ہیں جو کرتے تھے عیش میں گزران
نہ ہوش ہی ہیں ٹھکانے، نہ باقی ہیں اوسان — ذلیل و خوار ہیں، پھرتے ہیں جا بجا حیران
فلک نے پھینک دیا ہے کہاں کہاں اُن کو
بجاے زمزمہ ہے نالہ و فغاں اُن کو

الٰہی! بھاگ کے یاں سے کوئی کہاں جاوے — کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں، جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں، جس جا پے اماں جاوے — اگر زمین پھٹے، تو سما وہاں جاوے
دکھائی دیتا ہے ہر اک عدوے جاں اپنا
بنا ہے دشمنِ جانی، یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے — کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خوں چکاں لکھے — کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے
دعاے قاتلِ غمگیں ہو مستجاب، خدا!
بنی ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا!

ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار گھیر سنجی رام پور یو، پی سے شایع کیا

نگار دوستوں سے :

اپنے شہر کے بڑے اخبار فروشوں

لائبریریوں ، اسکولوں ، کالجوں اور

صاحبِ ذوق دوستوں کے پتے ایک کارڈ پر لکھ کر بھیج دیں

شرط یہ ہے کہ

یہ سارے پتے وہ ہوں جن کی ایمان داری دلچسپی

اور

خوش ذوقی پر آپ کو بھرپور اعتماد ہو

نگار

کی خریداری کے لیے ان سے براہِ راست ہم بھی کہیں گے

اور آپ بھی کہیں